Direction: MADAN MOHAN Supervision: K. D. MEHRA
Music: CHANNI & PARKASH Supervision: GHULAM HAIDAR

MOVIE MAKERS LTD., MCLEOD ROAD, LAHORE

کار۔

چغتائی

قاسمی

آزاد

کانتا

JANU

194

The dream girl of Picture-goer
SHIRIN in
BUTKADA'S BUT TRASH

SHIRIN
a new find in
BUTKADA'S BUT-TRASH

RAGANI
in
"FARAZ"

سال رواں کی حسین تریں دریافت .. شیریں .. کاومبری کا ہر دلعزیز ہیرو .. پریش
شوخ وشنگ حسینہ .. فریدہ .. جذبات نگار اور کار .. ہیج ہیرا
ہندوستان کی مشہور رقاصہ .. گوگو .. اور سرزمین پنجاب کا .. پران
سب ملکر آپ کی خدمت میں صرف ایک شاہکار پیش کرتے ہیں۔
بُت تراش
ہدایت: بی۔ ڈی۔ گارگا
افضل جہانگیر
موسیقی: غلام حیدر
آرٹ: سوبھا سنگھ
گانے: امین گیلانی
پروڈکشن چیف
رفیق دلشاد
۱۹۴۷ء کا ناقابل فراموش شاہکار
کہانی، منظر نامہ
ایس۔ اے۔ فضلی
اور مہندی کے خالق
گانے مکالمے
ساغر نظامی
حیا
تفصیلات کیلئے لکھیے:- بُت کدہ ۵۲ میکلوڈ روڈ لاہور

ہفتہ وار آبشار لاہور (ماہوار ایڈیشن) جلد ۶ ۔ نمبر ۱

ہمارے خیالات

جو تحریکیں کسی اجتماعی پس منظر کے تحت شروع کی جاتی ہیں قابل تحسین بھی ہو سکتی ہیں، اور سماج کے لئے نقصان دہ بھی۔ ہر ترقی پسند طبقے کو جو گرد و پیش کے غلط اور پرانے نظریوں کو بدلنا یا ہٹانا چاہتا ہے ایسی تحریکوں کے بنیادی مقصد کی حد تک تو ہمدردی ہوتی ہے اور ہونی چاہیئے۔ لیکن جب ان نظریوں کو تبدیل کرنے کی خواہش کے پیچھے اجتماعی کی بجائے انفرادی خود غرضی کام کر رہی ہو۔ تو اس کے مضر اثرات کے خلاف آواز اٹھانا ہمارا فرض ہے

گذشتہ دنوں لکھنؤ یونیورسٹی کے طلباء نے سینماؤں پر پکٹنگ کی۔ ان کا بائیکاٹ کیا۔ ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ کہ جنگ سے پیدا شدہ گرانی ضروریات زندگی کی نایابی اور طلبا کی ضروری کتابوں کی قیمتوں کے بڑھ جانے سے طلبا کے اخراجات میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہو گیا ہے اس لئے سینما ہالوں کے مالکوں کو طلبا کیلئے ٹکٹوں کی شرحیں کم کرنی چاہئیں۔ اسی نوعیت کا ایک اور مظاہرہ لاہور کے طلبا کی طرف سے بھی شروع کیا جا چکا ہے۔ بظاہر یہ مطالبہ اونٹ کے منہ میں زیرہ، یا "چھوٹے منہ بڑی بات" کے مصداق دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ ہم اسے اقتصادی نقطۂ نگاہ سے اہم بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن طلبا کی دلیلوں میں قوت اور وزن کا فقدان دکھائی دیتا ہے زیادہ سے زیادہ ہم اسے "شوخیٔ وقت" یا "رعنائی خیال" سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ گرانی کا اثر طلباء کی بجائے طلبا کے والدین پر پڑا ہے۔ یعنی یہ اثر طلبا پر براہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ پڑا ہے۔ اس لئے ان کی چیخ و پکار کے پس منظر میں صداقت اور خلوص کی کمی دکھائی دیتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جو تحریک، کم صداقتی کی بنیادوں پر کھڑی کی گئی ہو۔ اس کی دیواروں میں بہت تھوڑی مدت تک استواری اور قیام کی قوت باقی رہ سکتی ہے اس کے بعد ایک فطری انتشار اس دیوار کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ اور تحریک دھڑام سے نیچے آ گرتی ہے۔

اس تحریک کے اجتماعی احساس سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور ہمیں اس بنیادی اہمیت اور سچائی سے بھی انکار نہیں۔ کہ سرمایہ دار لوٹ کھسوٹ نے دورانِ جنگ میں جس قدر کامیاب حربے استعمال کئے اسی قدر سینما ہالوں کے مالکان نے بھی شرحوں کے اضافے کا حربہ استعمال کیا۔ روپے کی بہتات نے عوام کی قوتِ خرید میں ایک ہنگامی اضافہ کر دیا تھا چنانچہ انہوں نے ہر گرانی کو برداشت کیا۔ چہ جائیکہ یہ برداشت ایک مسلسل چیخ۔ چلاہٹ کی موجودگی میں جاری رہی۔ اسی طرح شرحوں کے اضافے کو بھی جنگ کا منطقی ردِ عمل سمجھ کر عوام نے اسے قبول کیا۔ اس طرح غیر شعوری اور جذباتی طور پر سرمایہ دار مالکان سینما کی تجوریوں کے پیٹ پھولتے چلے گئے۔

اب آپ شرحوں کے اس اضافے کو طلبا کی متذکرہ بالا تحریک کی روشنی میں دیکھئے۔ تو صاف دکھائی دے گا۔ کہ جہاں تک بنیادی مقصد کا تعلق ہے کوئی سرمایہ دشمن عنصر اس کی افادیت سے انکار نہیں کر سکتا لیکن جب ہم اس بنیادی مقصد سے ذرا آگے بڑھ کر سوچتے ہیں۔ تو ہمیں طلبا سے اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان کی تحریک کے اجتماعی احساس کے پیچھے صرف ذاتی غرضمندی کا جذبہ نمایاں اور ابھرا ابھرا دکھائی دیتا ہے۔ کیا ہم طلبا سے پوچھ سکتے ہیں۔ کہ جس مقصد کو لیکر وہ اٹھے ہیں۔ اور سماج کے جس ذہین اور باشعور طبقہ سے وہ تعلق رکھتے ہیں۔ کیا اس کا یہی تقاضا ہے۔ کہ آپ خود غرضی جیسی سطحی اور عامیانہ چیز کے پیچھے اپنی قوت کا استعمال کرتے رہیں۔ کیا یہ گرانی کالجوں کی چار دیواری تک محدود ہو کر رہ گئی ہے کیا انہیں نظر نہیں آتا کہ گرانی کا یہ شور و غوغا مشینوں، کارخانوں، ملوں، سرکاری دفتروں، پرائیویٹ اداروں، ریلوے کی ورکشاپوں میں بھی سنائی دیتا ہے۔ کیا گرانی کا یہ رونا صرف ان طلبا کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے جو والدین کی

کمائیوں پر منحصر ہو کر رہتے چلے آئے ہیں، ہمارا اتنا بڑا سماج صرف کالج کے اندر محدود نہیں ہے، یہ اس قدر وسیع ہے اور گرانی نے اپنے پاؤں اس قدر پھیلا لئے ہیں کہ طلبا کی تحریک اس کے مقابلے پر بے جا حقیرانہ اور خود غرضانہ دکھائی دیتی ہے۔

طلبا ہماری نئی نسل کے عظیم ستون شمار کئے جاتے ہیں ہمارے عوام کے مقابلے پر ان کا اقتصادی، سیاسی اور سماجی شعور زیادہ واضح اور نکھرا ہوا ہے۔ پھر ہمیں سمجھ نہیں آتا۔ کہ ان کی موجودہ تحریک کیوں خود غرضی جیسے تنگ و تاریک خول میں سمٹ کر رہ گئی ہے انہیں اپنے آپ کو اتنی بڑی سماج کا ایک جزو تصور کرنا چاہیئے۔ اور وہ جب کبھی کبھی اپنے باشعور مظاہرہ کرنے کا اقدام کریں۔ تو انہیں اپنی تحریک کے مقاصد کو ... پس منظر میں رکھ کر دیکھنا چاہیئے۔ انہیں اجتماعی افادیت کا ... ساتھ ہی نہیں دینا چاہیئے بلکہ آگے زیادہ سے زیادہ کامیابی کی منازل تک پہنچانا چاہیئے۔ اگر ٹکٹوں کی شرحیں صرف طلبا کے لئے رعایتی کر دی گئیں تو جہاں اس کا خاطر خواہ نتیجہ حاصل نہیں ہو سکیگا۔ وہاں ان پر سماجی غیر ذمہ داری کا الزام بھی لگایا جا سکیگا۔ آخر وہ کیوں یہ نہیں چاہتے۔ کہ شرحوں کی کمی کا مطالبہ ان مزدوروں اور متوسط درجے کے نوکر شاہی سسٹم سے بدل ... لئے بھی منظور کیا جائے۔ جو اس سامراجی نظام میں سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کا شکار ہو رہے ہیں۔ لیکن انہیں کوئی نہیں پوچھتا۔

ہم طلبا کی اس تحریک کا ساتھ دیتے ہیں لیکن انہیں اپنی تحریک اور اپنے مطالبے کی شکل و صورت بدل دینی چاہیئے۔ اسے اور زیادہ پھیلاؤ عطا کرنا چاہیئے۔ اور آگے بڑھ کر اپنی پوری اور ہندوستان بھر قوت کا استعمال کر کے سینما کے مالکوں کو مجبور کر دینا چاہیئے۔ کہ وہ مجموعی طور پر ہر بڑے شہر میں ٹکٹوں کی شرحوں میں انفرادی کمی کی بجائے عام کمی کا اعلان کر دیں ——— ماحول کی غلط قدروں کو بدلنے کا واحد طریقہ اب یہی ہے۔ کہ نہ صرف اپنے متعلق ہی سوچنا چاہیئے۔ بلکہ دوسروں کے متعلق بھی۔

"آبشار" کے صفحات اس تحریک کو تقویت پہنچانے کے لئے حاضر ہیں۔ اگر طلبا نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اپنے مطالبے کی اہمیت کا احساس پیدا کرانا اور اس سے خاطر خواہ نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہیں۔ تو انہیں جلد تر اپنی تحریک کو یہ رنگ دے دینا چاہیئے۔ ورنہ تحریک کی موجودہ شکل انتہائی رجعت پسندانہ اور غیر افادی ہے۔ اور اپنی موت آپ مرجانے والی تحریکوں میں سے ایک ہے۔

"نیوز پریڈ" کی تجدید

جنگی پروپیگنڈہ کرنے کے بعد "نیوز پریڈ" کا دور ختم کر دیا گیا تھا۔ لیکن "نیوز پریڈ" کے آئندہ کے لئے امکانات ضرور پیدا کر دیئے ہیں۔ خبر موصول ہوئی ہے۔ کہ سردار پٹیل اس محکمے کو دوبارہ میدان میں لا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم حکومت کی خدمت میں صرف اس قدر استدعا کریں گے۔ کہ اس محکمے کی دوبارہ پیدائش پر اس کے رنگ آہنگ کو ذرا بدل دیں۔ ہمارے عوام سامراجی پرچار کرنے والی ہر چیز کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اور یہ ممکن نہیں۔ کہ عوامی ذہنوں کی اس منزل پر انہیں گمراہ کرنے میں کامیابی حاصل کی جا سکے۔ اگر سردار پٹیل نے "نیوز پریڈ" کو نئی لائنوں پر نہ چلایا تو گزشتہ تجربے کی مانند ہندوستان کا قیمتی سرمایہ نقع زدہ کے مترادف ثابت ہوگا۔ کیونکہ عوام کے لئے تو اب افادی اور سماجی تاثرات ہی قابل قبول ہو سکتے ہیں۔ اور حکومت کا اولیں فرض یہی ہے۔ کہ عوام کے ترقی پسندانہ رجحانات کو سمجھے۔ اور موجودہ سماجی اور تہذیبی تقاضوں کی روشنی میں "نیوز پریڈ" کا لائحہ عمل مرتب کرے اگر یہ لائحہ عمل صرف سیاسی پارٹیوں کے پراپیگنڈے تک محدود رہا۔ تو نیوز پریڈ کے جنگی دور اور موجودہ دور میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوگا۔

اِندر دیوتا

ایک مقامی فلمی پرچے میں مشہور ترقی پسند شاعر فیض احمد فیض کی نظم "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ"۔ پر ایک صحرائی شاعر نے پیروڈی لکھنے کی کوشش فرمائی ہے۔ اور زبان و محاورے کے ایسے ایسے جلوے دکھائے ہیں کہ "سبحان تیری قدرت" یاد آجاتی ہے "پازیب کی جھنکار سے شب کا گُمنا"۔ شاید ماہیے مالوے کی نادر کاری معلوم ہوتی ہے۔ "گھنڈولی بنگ" کی ترکیب رُوشن کے "اُن چھنے" آٹے سے مرکب کی گئی ہے اور پھر بھنگی جب "ماہ کی پہلی پہلی" اپنے وارد غہ سے "جنس رد پہلی" لاتا ہے۔ تو آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگتے ہیں۔ "جنس رد پہلی" میں المنامنٹ کے اضافے سے بھی شاید مولانا حالی کی "پہلی مغربی" کی تقلید یا احق وفاداری نبھایا گیا ہے۔ اس موقع میں وزن بگڑ گیا ہے تو کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ آخر سردارانہ "ذوق نظر ہے۔ کبھی آنے کبھی جائے ——!

مشورہ تو وہ قبول نہیں فرمائیں گے۔ ورنہ ہم اس مرئی ذہیم شاعر کی خدمت میں نہایت عاجزانہ گذارش کرتے کہ حضرت یہ شاعری کانٹوں کا تاج ہے، اسے آپ ہمارے دوست ارش گرامی کے لئے رہنے دیجئے، اور آپ بچوں سے کھیل کھال کر جی بہلایا کیجئے اور اگر بیغمبری کے بغیر جی نہیں لگتا۔ تو پنجابی دوہے لکھنا شروع کر دیجئے۔ کیونکہ اُن کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا۔

× × × × × × × × ×

بڑا دلچسپ لطیفہ ہوا چائے کی گرم گرم پیالی کا ایک گھونٹ "چڑھا" کر ہمارے ایک منچلے دوست نے سوال کیا۔ "صاحبان یعنی لیڈیز اینڈ جنٹلمین! فرض کیجئے! مشہور ترقی پسند ادبی جریدے "ادبِ لطیف" کو دبیر الملک، سیف العلم، حضرۃ مولانا پروفیسر عابد علی عابد۔ بی۔اے۔ ایل۔ایل۔بی ——۔ ایڈٹ کرنے لگتے ہیں۔ تو نتیجہ کیا ہوگا؟ سوال کا حل بتانے والے کو پورے نمبر نہیں دئے جائیں گے بلکہ مستقبل کے لئے امکانات رکھنے پڑیں گے۔"

ساری محفل پر ایک تحیّر سا چھا گیا۔ سوال کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا تھا اور جواب کے ذریعے پیشین گوئی کرنا بھی کسی "کڑے کلیجے" کا ہی کام تھا۔ لیکن ایک منچلے نے فوراً کہا۔

بات صاف ہے اگر ایسا ہوا۔ تو کرشن چندر اپنا سب سے پہلا افسانہ "دین و دنیا" دہلی کو برائے اشاعت بھیج دیں گے۔

محفل زعفران زار بن گئی۔ اور قہقہوں کی گونج مال روڈ سے اٹھتی ہوئی سرکلر روڈ تک پھیل گئی۔

× × × × × × × ×

"الناصر" ہماری فلمی دنیا کی ایک دلچسپ شخصیت بنتا جا رہا ہے گذشتہ دنوں ایک مزیدار واقعہ ہوا۔ گپتا آرٹ پروڈکشن نے بمبئی کی ایک حسین و جمیل لڑکی نسرین کو اپنی فلم میں بطور ہیروئن راضی کر لیا۔ اور وہ کافرادا معہ اپنی والدہ محترمہ کے لاہور تشریف لائیں۔ شومئی قسمت سے شوٹنگ کے دوران میں فلم کا "ہیرو" کسی وجہ سے کمپنی چھوڑ کر چلا گیا۔ اب پروڈیوسر صاحب کو نئے ہیرو کی تلاش ہوئی۔ "الناصر" کا طوطی بول رہا ہے۔ چنانچہ اس بولتی ہوئی طوطی کا اس کمپنی سے معاہدہ ہو گیا۔

واقعے کی دلچسپی یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ کہ جب سیٹ پر الناصر کو بمبئی کی ساحرہ کے بالمقابل لایا گیا۔ تو اس کی "والدہ محترمہ" کا ماتھا ٹھنکا۔ الناصر کی "شکارگیری" اس کی آنکھوں میں پھر گئی۔ اس نے ایک نظر الناصر کی گول گول چمکتی اُبھرتی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ اور دوسری طرف اپنی معصوم بچی کا جائزہ لیا۔ اور فوراً چلا کر کہنے لگی۔

"ڈاکٹر صاحب! میری بیٹی اس بچے کے ساتھ کام نہیں کریگی۔"

ہاں! ــ اور الناصر کے ہونٹوں پر ایک آزمودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس مسکراہٹ کے جواب میں ایک آہ سرد بھر کر الناصر کی طرف دیکھا! ــ اور کہا "صاحبزادے! جیتے رہو بیٹے" اور پروڈیوسر صاحب الناصر کے متعلق سوچنے لگے۔ کہ آخر اس ہونہار خوبصورت جوان کا کیا بنے گا؟

× × × × × × × × × ×

آج تک آواز اٹھائی جاتی رہی کہ فلمی صنعت کو طوائفوں اور بازاری عورتوں کے گندگی بھرے دامن سے پاک صاف کر دینا چاہیئے۔ اور اعلیٰ خاندان کی لڑکیوں کو اس صنعت کی سرپرستی قبول فرمانی چاہیئے۔ یہ آواز ان اخبار نویسوں کی طرف سے اٹھائی جاتی رہی، جو سماج کی اخلاقی گراوٹوں پر ہر روز آنسوؤں کے دریا بہا دیتے ہیں۔ لیکن جب عرش اعظم یعنی اچھے خاندانوں تک ان کی آواز پہنچی۔ اور خاندانی لڑکیاں فلموں میں گھس آئیں، تو اب ان آنسو بہانے والوں نے ایک نیا پہلو نکالا ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ اپنے آنسوؤں کی روانی کو ختم ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ اس لئے لکھ رہے ہیں۔ کہ ان خاندانی لڑکیوں نے "گند" پھیلا رکھا ہے۔ ان سے تو بیچاری رنڈیاں ہی اچھی تھیں۔ جو نگار خانوں میں آتے ہی "خدمت آرٹ" پر تل جاتی تھیں ــ ان کے خیال میں ان خاندانی لڑکیوں کی اخلاقی حالت پیشہ وروں سے بھی گئی گزری ہے۔

ہمیں سمجھ نہیں آتی کہ ایسے ایڈیٹر صاحبان آخر چاہتے کیا ہیں کیا وہ براہ کرم اپنی اخلاقی قدروں کی بنا پر "اچھے اور برے" میں کوئی

سو بار غلامی سے بغاوت بہتر
دھوکے کی محبت سے عداوت بہتر

جوش ملیح آبادی

منظوم کہانیاں

سراج لکھنوی

وہ سر مرا - وہ یار کا زانو - وہ شامِ وصل
اللہ! پھر وہ خواب نہ آیا نظر مجھے

شیفتہ

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

قاسمی

گنگنانا تو اک بہانا تھا
بس تجھے اس طرف بلانا تھا
اور دکھا کر یہ مسلے مسلے پھول
تیرے احساس کو جگانا تھا

قاسمی

دیکھو ری - رُوپ یہ کیا تو نے بنایا پگلی
پپڑیاں ہونٹوں پہ اور زلف تیری آوارہ
میں سہیلی ہوں تری - مجھ سے یہ پردا کیسا
کیا کلیجے میں ترے تیر کسی نے مارا؟

ساحر لدھیانوی

اپنی تباہیوں کا مجھے کوئی غم نہیں
تم نے کسی کے ساتھ محبت نبھا تو دی

فراق

تجھ سے چھٹ کر اوروں سے بھی جھوٹا سچا پیار کیا
وہ بھی تیرے عشق کے حیلے، وہ بھی تیرے غم کے بہانے

اختر شیرانی

ہو کے ناکام ہوس کار بنے کیوں اختر
یادِ سلمیٰ میں جوانی کو گنوا دینا تھا

آنسوؤں۔ آہوں اور قہقہوں کی کہانی
دھڑکتے ہوئے نوجوان دلوں کی زبانی

ڈائریکٹر: نرنجن

میوزک: کے ایس ساگر

قرض

کیمرہ: ڈی مہتہ

ساؤنڈ: اوہنی چیٹرجی

رقص: گیان شنکر

اداکاران: راگنی۔ سدھیر۔ چاند برق۔ رُوفی۔ بھاگ سنگھ
ابوشا۔ لیلا۔ فریدہ۔ آغا اشرف۔ زاہدہ۔ ایس محمود ابیل برق
بر اں بعین وغیرہ

اپر انڈیا سٹوڈیو میں تکمیلی مراحل طے کر رہا ہے۔

صوبجاتی حقوق کیلئے لکھیے: نیو ہندوستان پکچرز لمیٹڈ ۶۷۔ رائل پارک لاہور

سی۔ پی۔ سی۔ آئی ڈسٹری بیوٹرز۔ راجپوتانہ فلمز لمیٹڈ جودھپور۔

عصمت چغتائی

لال چیونٹے

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

اور اب بھی جب خزاں کے اختتام پر بد رجھ کر پیڑوں پر سبز تمغے ٹمٹمانے لگتے ہیں۔ وہ پہریں سنسان اور اداس ہوتی جاتی ہیں اور وقت کاٹے نہیں کٹتا تو پھر سے وہ بھولی بسری یادیں تازہ ہو کر دماغ میں چٹکیاں لینے لگتی ہیں۔

ایسی ہی ایک اجڑی ہوئی دوپہر کو جب لو کے جھکڑ آتشیں بھوتوں کی طرح فضا میں ناچ رہے تھے اور سڑکیں بیوہ کی مانگ کی طرح اجڑی اور خاک آلودہ ہو رہی تھیں۔ باسلیقہ انسان خس کی ٹٹیوں کی آڑ میں دبکے بیٹھے تھے میں چھل پائی بنی آم کے درختوں کے نیچے سر اٹھائے اس تاک میں گھوم رہی تھی کہ کوئی سیدھا سادھا درخت ہاتھ پڑ جائے تو یہ دوپہر اتنی غمگین اور روکھی نہ رہے۔ میری بادیہ پیمائی بیکار نہ گئی۔ اور آن کی آن میں دو دیپ اناز، میں جھاڑ جھنکاڑ پھنیوں میں ہرے ہرے تمغے تلاش کرنے لگی۔ جھولی بھرنے سے پہلے ہی جی بھر آیا۔ اور میں نے ایک پیاری سی کیری کو۔۔۔۔۔۔۔

اس سے قبل کہ میرے بھوکے دانت سبز چادر کو چاک کر کے بدبودار گٹھلی سفیدی تک پہنچتے ایسا معلوم ہوا کہ سارے جسم پر بجلی کے ننگے تار لپٹ گئے۔ میں مفلوج سی ہو کر نیچے بیٹھی اور دوسرے لمحے گھر والوں نے مجھے مرغ بسمل کی طرح زمین پر تڑپتے ہوئے پایا —— لال چیونٹے!

جب ذرا بدحواسی کم ہوئی تو میں نے دیکھا کہ جسم پر لال لال چیونٹے پڑ گئے ہیں، ہر چیونٹے کے بیچوں بیچ ایک بھیانک چیونٹے کا لال لال سر یاقوت کی بوند کی طرح سیفٹی پن سے لٹکا ہوا تھا۔ اس ہائے توبہ میں دھڑ تو جھڑ گئے تھے۔ مگر توبہ کیجئے کھوپڑیاں اسی ڈھٹائی سے دانت گاڑے ہوئے تھیں کہ معلوم ہوتا تھا۔ چنگلیلیں کی چادر جسم پر چپک گئی ہے۔

یہ بتانا بیکار ہے کہ اس کے بعد گنے دن مرہم پٹی، پیپ خون

کچیانے ہوئے مرہموں سے دست و گریبان رہنا پڑا۔ کچے آموں سے الگ ہاتھ دھونا پڑا۔

یہی وجہ ہے کہ آج بھی جبکہ بڑے بڑے معرکے سر کر ڈالے ہیں زندگی کے الجھن نے بھی جی بھر کر کھرتا بنا دیا ہے وہ دمکتی ہوئی دوپہر دل و دماغ پر اپنی مکمل عفریت کے ساتھ کھڑی ہوئی ہے۔ اور اسی یاد کا واسطہ دے کر ناظرین سے التجا ہے کہ خواہ آپ کی دوپہریں کتنی بھی اداس اور سنسان ہو جائیں۔ للہ بھول کر بھی ایسی جگہ قدم نہ رکھئے گا۔ جہاں یہ خونی درندے اپنا خیمہ گاڑ چکے ہوں۔۔۔۔ وہ آپ ابھی مسکرا رہے ہوں گے کہ میں کتنی احمق ہوں۔ ماشااللہ آپ بھی کوئی ننھے ہیں۔ جو جلتی دوپہروں میں آموں کی تلاش میں لال چیونٹوں سے الجھنے جائیں گے۔ تو عرض ہے کہ یہ دنیا بالکل گول مول ہے۔ قدم بڑھاتے وقت بعض وقت داؤں پیچ میں اپنا ہی پیر کھلپ جاتا ہے۔ یہاں ہر قدم پھونک پھونک کر دھرنا چاہیے۔ کون جانے یہ لال چیونٹے آپ کی آستین ہی میں سانپ بنے بیٹھے ہیں۔ اور کیا! کون جانے! کم از کم میں تو نہیں جانتی تھی جبھی تو ایک اداس دوپہر کے پھر سے مجھے تنہائی اور بیکاری نے اکسایا۔ اور میں جیتے ہوئے واقعہ کو بھول کر دوبارہ لال چیونٹوں سے ٹکرا گئی۔ بات یوں ہوئی کہ ایک تھکی ہوئی سی شام کو جب تمام باسلیقہ انسان سی۔ سی۔ آئی۔ اور نیشن کوروں میں تہذیب اور انسانیت کا بلے لیکر و ظیفہ دہرا رہے تھے۔ میں تھکی ہوئی بچھل پائی کی طرح سر جھکائے اس تاک میں گھوم رہی تھی کہ کوئی سیدھا سادا مشغلہ ہاتھ آ جائے تو یہ شام اتنی نیم مردہ اور پریشان کن نہ رہے۔ ٹیکسی کا میٹر چڑھ رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ میرے غصے کا پارہ بھی اونچا ہوتا جا رہا تھا۔ ہر سینما ہال کے آگے ڈراؤنے اشتہار دیکھ کر اور بھی جی بھن گیا۔ وہ اٹھوک لگار کی چٹخنی جیسی ٹھوڑی مہتاب کے ابلتے ہوئے بدن۔ سورن لتا کا دق زدہ ڈھانچہ۔ دیتا

آنسوؤں۔ آہوں اور قہقہوں کی کہانی
دھڑکتے ہوئے نوجوان دلوں کی زبانی

فرض

ڈائریکٹر:۔ نرنجن

میوزک:۔ کے ایس ساگر

کیمرہ:۔ ڈی مہتہ

رقص:۔ گیان شنکر

ساونڈ:۔ اوہنی چیٹرجی

اداکاران:۔ راگنی۔ سدھیر۔ چاند برق۔ روفی۔ بھاگ سنگھ
ابوشا۔ لیلا۔ فریدہ۔ آغا اشرف۔ زاہدہ۔ ایس محمود ابیبل برق
بران لعین وغیرہ

ایرانڈیا سٹوڈیو میں تکمیلی مراحل طے کر رہا ہے۔

لال چیونٹے

عصمت چغتائی

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

اور اب بھی جب خزاں کے اختتام پر بدرجھر کر پیڑوں پر سبز تمغے ٹمٹمانے لگتے ہیں۔ دوپہریں سنسان اور اداس اونگھتی ہوئی ہو جاتی ہیں اور وقت کاٹے نہیں کٹتا تو پھر سے وہ بھولی بسری یادیں تازہ ہو کر دماغ میں چٹکیاں لینے لگتی ہیں۔

ایسی ہی ایک اجڑی ہوئی دوپہر کو جب لو کے جھکڑ آتشیں بھوتوں کی طرح فضا میں ناچ رہے تھے اور سڑکیں بیوہ کی مانگ کی طرح اجڑی اور خاک آلودہ ہو رہی تھیں۔ باسلیقہ انسان خس کی ٹٹیوں کی آڑ میں دبکے بیٹھے تھے میں چھل پائی بنی آم کے درختوں کے نیچے سر اٹھائے اس تاک میں گھوم رہی تھی کہ کوئی سیدھا سادھا درخت ہاتھ پڑ جائے تو یہ دوپہر اتنی غمگین اور روکھی نہ رہے۔ میری بادیہ پیمائی بیکار نہ گئی۔ اور آن کی آن میں دوپٹہ اتار، میں جھاڑ جھنکاڑ ٹہنیوں میں ہرے ہرے تمغے تلاش کرنے لگی۔ جھولی بھرنے سے پہلے ہی جی بھر آیا۔ اور میں نے ایک پیاری سی کیری کو........

اس سے قبل کہ میرے بھوکے دانت سبز ملبوس کو چاک کر کے بے ہوش کن سفیدی تک پہنچتے ایسا معلوم ہوا کہ سارے جسم پر بجلی کے ننگے تار لپٹ گئے۔ میں مفلوج سی ہو کر نیچے پھسلی اور دوسرے لمحے گھر والوں نے مجھے مرغ بسمل کی طرح زمین پر تڑپتے ہوئے پایا ——— لال چیونٹے!

جب ذرا بدحواسی کم ہوئی تو میں نے دیکھا کہ جسم پر لال لال چٹے پڑ گئے ہیں، ہر چٹے کے بیچوں بیچ ایک بھیانک چیونٹے کا لال لال سر یاقوت کی بوند کی طرح سیفٹی پن سے ٹکا ہوا تھا۔ اس ہائے توبہ میں دھڑ تو جھڑ گئے تھے۔ مگر توبہ کیجئے کھوپڑیاں اسی ڈھٹائی سے دانت گاڑے ہوئے تھیں کہ معلوم ہوتا تھا۔ چنگاریوں کی چادر جسم پر چپک گئی ہے۔

یہ بتانا بیکار ہے کہ اس کے بعد کتنے دن مرہم پٹی، پیپ خون چھپاتے ہوئے مرہموں سے دست و گریبان رہنا پڑا اور کچے آموں سے الگ ہاتھ دھونا پڑا۔

یہی وجہ ہے کہ آج بھی جبکہ بڑے بڑے معرکے سر کر ڈالے ہیں زندگی کی الجھن نے بھی جی بھر کر ٹھیرتا بنا دیا ہے وہ دہکتی ہوئی دوپہر دل و دماغ پر اپنی مکمل عفریتیت کے ساتھ کھڑی ہوئی ہے۔ اور اسی یاد کا واسطہ دے کر ناظرین سے التجا ہے کہ خواہ آپ کی دوپہریں کتنی بھی اداس اور سنسان ہو جائیں۔ للہ بھول کر بھی ایسی جگہ قدم نہ رکھئے گا۔ جہاں یہ خونی درندے اپنا خیمہ گاڑ چکے ہوں...... اور وہ آپ ابھی مسکرا رہے ہوں گے کہ میں کتنی احمق ہوں۔ ماشاءاللہ آپ بھی کوئی ننھے ہیں۔ جو جلتی دوپہروں میں آموں کی تلاش میں لال چیونٹوں سے الجھنے جائیں گے۔ تو عرض ہے کہ یہ دنیا بالکل گول مول ہے۔ قدم بڑھاتے وقت بعض وقت داؤں پیچ میں اپنا ہی پیر کٹ جاتا ہے۔ یہاں ہر قدم پھونک پھونک کر دھرنا چاہیے۔ کون جانے یہ لال چیونٹے آپ کی آستین ہی میں سانپ بنے بیٹھے ہوں۔ اور کیا! کون جانے؛ کم از کم میں تو نہیں جانتی تھی۔ تبھی تو ایک اداس دوپہر کو پھر سے مجھے تنہائی اور بیکاری نے اکسایا۔ اور میں بیتے ہوئے واقعہ کو بھول کر دوبارہ لال چیونٹوں سے ٹکرا گئی۔ یاں یوں ہوئی کہ ایک تھکی ہوئی سی شام کو جب تمام باسلیقہ انسان سی۔سی۔آئی۔ اور ریس کورس میں تہذیب اور انسانیت کا بلے لیٹر و لطیفہ دہرا رہے تھے۔ میں تھکی ہوئی چھل پائی کی طرح سر جھکائے اس تاک میں گھوم رہی تھی کہ کوئی سیدھا سادا مشغلہ ہاتھ آ جائے تو یہ شام اتنی نیم مردہ اور پریشان کن نہ رہے۔ ٹیکسی کا میٹر چڑھ رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ میرے غصے کا پارہ بھی اونچا ہوتا جا رہا تھا۔ سینما ہال کے آگے ڈراؤنے اشتہار دیکھ کر اور بھی جی جل گیا۔ وہ اشوک کمار کی چپٹی جیسی ٹھوڑی، مہتاب کے ابلتے ہوئے ہونٹ۔ سورن لتا کا دق زدہ ڈھانچہ۔ دینا

کا پہلوانی باتز و۔ توبہ میری ایسی کون خطا ہو گئی۔ جس کے جرم میں یوں عذابِ دوزخ سے ڈرایا جا رہا ہے۔ "ٹیکسی موڑو" میں نے جھنجھلا کر ڈرائیور کو ڈانٹا۔ کونے پر موٹر لوٹتے لوٹتے بچ کر رک گئی۔ سامنے ایک عجیب الخلقت اشتہار لگا تھا۔ "امرِ ہندوستان ...... اکسیلیبر.. عوامی تھیٹر"۔ ان تین چیزوں نے بوکھلا کر دیا۔ یہ بھلا امرِ ہندوستان کون شے ہے؟ ضرور کوئی بھوتوں کا قصہ ہو گا۔ جی مجھے بھوتوں کے قصے بہت پسند ہیں۔ پتہ نہیں کیوں؟ ضرور کسی ممی کے افسانہ عشق کا جھگڑا ہو گا۔ ورنہ حضرت ہندوستان کو تو رحلت فرمائے کافی عرصہ ہو گیا۔ اور اب تو سڑ گل کر دوسرے ملکوں میں بطور کھاد کے استعمال کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں ہندوستان تو بیشک بنجر ملک ہے۔ مگر اس کی کھاد بڑی زرخیز ثابت ہو رہی ہے۔ میں زیادہ حیل و حجت کی قائل نہیں۔ حکمائے اعظم کے اس بیان پر کہ ہندوستان مر چکا ہے میں نے کبھی کا فاتحہ پڑھ ڈالا ہے۔ جب مر ہی گیا تو پھر واویلا سے کیا فائدہ۔ لاش پیٹنے سے کیا حاصل۔ مرحوم کی روح کو اور عذاب ہو گا۔ بہتر تو یہی ہے کہ اس سڑاندی لاش کو چٹ پٹ دفن کر کے دھوم دھام کا تیجہ کیا جائے اور دوسرے زندہ ملکوں کی طرف منہ اٹھا کر دل کو ڈھارس دے لی جائے۔ بھئی ہم نے تو اپنی سی سب کر دیکھی۔ دیکھئے نا کمبخت ملک کی خاطر کیا کیا دکھ نہیں سہے گو بیسے خود میں نے تو نہیں۔ مگر ہاں میرے پیارے ملک کے جانثاروں نے کیا کچھ نہ بھگتا۔ اور بھئی میں کیا بذاتِ خود بھگتنی تھی کچھ ہوتا۔ ایسے کیا مجھ میں سرخاب کے پر لگے تھے کہ میری قربانی سے پھٹاک سے ملک آزاد ہو جاتا۔ ارے بھئی اس ڈھیٹ ملک کو آزاد ہونا ہوتا تو کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتا۔ اب کیا ضروری تھا کہ سب کے سب لپیٹ میں آ جاتے اور کیا، سچی بات تو یہ ہے کہ ابھی کچھ امید ہو تو کوئی کچھ کرے بھی۔ ہاں نہیں تو، ویسے اوٹ پٹانگ کی قربانیاں کر بیٹھو۔ جیل سے بچے۔ تو عمر جیل یعنی سرکاری نجم گردیاں، ایک سرے سے بفضلہ سے غائب۔ بھئی نہ تو میں ایسی حماقتوں کی طرفدار اور نہ ہی قائل۔ اور کیا؟

ہاں تو میں نے کہا کیا حرج ہے آج "امرِ ہندوستان" کا ڈھکوسلہ ہی چلے۔ ارے ایسا بھی کیا ڈرنا۔ کوئی بھوت تھوڑا ہی لپٹ جائے گا۔ دوسرے ایکسلیبر! یعنی ویسی تھرا اور ایک دم ناچ ہیں! کیا کچھ نہ معجون مرکب ہو گی! مگر لفظ "عوامی" سے ذرا جی کھٹکا۔ کیا کہے گا ٹیکسی والا کہ میم صاحب دیکھنے میں تو خاصی ہیں۔ پر ہیں ذرا نچلے طبقے کی۔ خیر جی کڑا کے کہہ ہی دیا۔

دروازے پر سے ہی جی بیٹھنے لگا۔ قدم رکھتے ہی سامنے دو چار نچے کچھے گنجے حلیہ کے ہیولے منڈلاتے نظر آئے۔ دو تین پھوہڑ قسم کی لڑکیاں پروگرام بیچ رہی تھیں۔ ڈیمینٹی کو تو میں صاف پہچان گئی پرلے درجہ کی لچگی۔ ماشاءاللہ پوری آستین کا کرتا گرمی کے زمانہ میں دانتوں سے نوچ کر نیم آستین بنا لیا جاتا ہے۔ کنارے ترپنے کی توفیق نہیں۔ اور چلی ہیں پروگرام بیچنے۔ ارے ایسا ہی تھا تو پوپٹ والا کی لڑکیوں کو بلا لیا ہوتا۔ خدا قسم نامیوں تک کا بیڑا ڈبو کر ڈالیں! بارہ آنے کا پروگرام ایک روپیہ میں لے کر میں تو جلدی سے آگے بڑھی۔ ٹپ دینے کی کمبخت ایسی بری عادت ہو گئی ہے۔

ہال میں جا کر منہ اتر گیا۔ بس یہ سمجھئے بنگال کے قحط کا سماں کھنچا ہوا تھا۔ پراگندہ اکا دکا ذلک کی ستائی صورتوں کے دو چار بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ ہائے یہ میں نے کیا حماقت کی اس سے تو بھگت بودانا ہی دیکھ آتی۔ خیر کیا ہوا جی میں سوچا لوٹ چلوں۔ کہ ایک دم سے میری نظریں لڑکھڑا کر رک گئیں۔ سامنے تیسری کرسی پر راج بیٹھا ہوا دھوئیں کے بادلوں میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

تو میری بادیہ پیمائی بیکار نہ گئی۔ دوسرے لمحے راج میرے برابر والا کرسی پر تھا۔ اور میں اس کے سگرٹ کے دھوئیں میں غلطاں اور پیچاں۔

لیجئے بسم اللہ ہی غلط پڑا۔ اٹھا تو دو چار ملگجے کپڑے پہنے اجڑے حلیہ کے لوگ نظر آئے۔ نہ پوڈر نہ دودھ نہ جھم جھماتے کپڑے بس میلی ہوئی دھوتیاں اور ڈھیلے ڈھالے کرتے۔ اور قومی ترانہ شروع ہوا۔

مجھے یاد ہے یہی ترانہ علیگڈھ کالج میں صبح ہی صبح گایا جاتا تھا۔ کیا سریلی اور لیٹی لیٹی لے ہوتی تھی۔ کہ گاتے ہی میں جمائیاں آنے

لگتی تھیں اور زور یہی جی چاہتا تھا۔ کہ بس آج تو بجائے پڑھانے کے سب لڑکیوں کو نرم نرم تکئے دے کر ہال ہی میں پڑ رہنے کی اجازت دے دی جائے تو مزہ آجائے۔ شروع میں تو خیر مگر جوں جوں نغمہ تیز ہوتا گیا دل کی حرکت بڑھتی گئی۔ آخر میں ایسا معلوم ہوا۔ کہ دل و دماغ کی ساری کھڑکیاں کھولی ہی نہیں گئیں بلکہ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر توڑ ڈالی گئیں۔ جانو جوتے مار مار کے منوایا جا رہا ہے کہ "ہندوستان ہمارا" گرج گرج کر چنگھاڑا جا رہا ہے کہ ایک دفعہ تو بہرا کان بھی چیخ اٹھے۔ بھلا ان اللہ کے بندوں سے کس نے کہا ہوگا کہ اتنی گرمی کے زمانے میں ایسا بھڑکتا ہوا راگ رکھ دو۔ کہ دماغ میں چرکے لگنے لگیں۔ اور جی بے بات ہلکان ہو جائے۔ غریب راج ویسے ہی جذباتی ہے اس کا سینہ اوپر نیچے ہونے لگا۔ پروگرام کا ورق الٹا۔

اندھیری گھپ اسٹیج پر لال لال بھوت اپنی پوری خباثت سے جھپٹا۔ نقارے کی چنگھاڑ سنکر سارے ساز چونک اٹھے غرانے لگے۔ نفیری چیخ اٹھی۔ اور ستار جھلانے لگے۔ سازوں کی فوج ڈکار پکار کر انسانوں کو پکارنے لگی۔ دم بھر میں جی وار چاروں طرف سے ننگی تلواریں چمکاتے ٹوٹ پڑے۔ پرے کے پرے امنڈ کر دشمن پر الٹ پڑے۔ پنے تلے قدموں سے بڑھتے ہوئے تیکھی تیکھی نظروں سے گھورتے ہوئے۔ وہ سب کے سب نشانہ باندھ کر میری آنکھوں میں گھسنے لگے۔ مگر مجھے آنکھ جھپکانے کی ہمت نہ ہوئی۔ خدا خدا کرکے پردہ گرا اور میں نے جھنجھوڑ کر اپنے آپ کو جگایا۔ لاحول ولا قوۃ تین آدمی تو تھے ہی اسٹیج پر۔ اور وہ بھی مڈوں جیسے سوکھے مارے پر میرے واہمہ نے انہیں تین ہزار بلکہ تین لاکھ کیوں بنا لیا۔ اور تین ہی تو عورتیں تھیں۔ چھوٹی چھوٹی پھولے پھولے گالوں والی۔ مگر یہ ان کی آنکھوں میں کیا دہک رہا تھا۔ جیسے دبے گھٹے آتش فشاں کا نیلا نیلا دھواں۔

جی چاہا گھبرا کر بھاگوں۔ مگر جیسے وہ مصنوعی تلواریں میرے جسم کے ٹکڑے کر گئی تھیں۔ "بھاگ یہاں سے" پیر کہتے تھے۔

"ذرا ٹھیرا!" دل نے پکارا۔ ان اعصاد کی تو تو میں میں سے ہلکان ہو کر میں اور بھی سہم گئی۔ پسینہ پونچھ کر میں نے راج کی طرف دیکھا اور بالکل ہی لرز گئی۔ پردہ گر چکا تھا۔ مگر معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آنکھوں پر سے جلدی جلدی سینکڑوں پرت پر پردوں سے اٹھتے چلے جا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ایک زہر میں بجھی ہوئی چمک تھی۔ اور ہزاروں ننگی تلواریں ناچ رہی تھیں۔ اس کا سینہ بوجھل بادلوں کی طرح ابل ابل کر دب رہا تھا۔

"راج"! میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ مگر جلد ہی اس بھونچال سے سہم کر دور ہٹ گئی۔ "راج" میں نے پھر پکارا۔ "کیا طبیعت خراب ہے"۔ "نہیں تو۔" اس نے اپنے آپ کو کسی دور دراز کی دنیا سے واپس کھینچ کر کہا۔ "گھر چلوگے؟"

"نہیں...... اس وقت ڈانٹ بتائی۔ توبہ ہے۔ لعنت ایسے تماشہ پر کہ جی ہلکان ہو جائے۔ بر الٹے ہاتھ پر شانتی تھا۔ اور سامنے پریم...... میں ان سب کو جانتا ہوں" اس نے فخریہ کہا گویا ان سب کو جاننا ہی مقصد زندگی ہو۔

"وہ سچن شنکر تھا اودے کا رشتے کا بھائی!"

"ارے وہ لمبوترا سا"

"وہ لمبوترا سا قطعی نہیں تھا"۔ اسے لو۔ راج برا مان گیا۔ "وہ بہت خوبصورت ہے"۔ "ضرور ہوگا" میں نے جل کر کہا۔ "مگر اودے شنکر کا بھائی! خوب کماتا ہوگا"۔ "وہ کچھ بھی نہیں کماتا"۔ گویا کچھ بھی نہ کمانا بڑے کمال کی بات ہے۔ "چالیس روپیہ ملتے ہیں"۔

"روز...... تو اور کیا کسی کا سر لے گا۔"

"جی۔ روز نہیں، مہینہ بھر میں"!

"ارے۔ اودے شنکر اسے کچھ نہیں کہتا"

پروگرام کا دوسرا ورق الٹا۔ مگر میں ان احمق نوجوانوں کے متعلق ہی سوچتی رہی۔ آہ یہ ہونہار یوں مٹی میں عاقبت رولا رہے ہیں۔ ایسے صاحب۔ یہی تو وقت ہے کمانے کا۔ اور کچھ نہیں تو کسی فلم کمپنی ہی میں چلے جائیں۔ دیکھئے نا کیا بھیانک ناچ فلموں میں ہوتا ہے۔ اور لاکھوں مل جاتے ہیں۔ اس سے تو چھبیلا راج ہی زیادہ عقلمند ہے۔ مزے سے ایک ناچ سیکھ لیا ہے بس اسی کے ذریعہ ہزاروں روپیہ کما رہا ہے۔

میں نے چونک کر راج کو دیکھا۔ وہ آتش فشانی کیفیت غائب کرکے مجسم شعر بنا بیٹھا تھا۔ اسٹیج پر رنگ برنگی چڑیاں سُر تال پر پھدک رہی تھیں معلوم ہوتا تھا وہ ساز پر نہیں ناچ رہی ہیں۔ بلکہ یہ میٹھے میٹھے سُر ان کی نازک نازک حرکتوں سے ٹپک رہے ہیں۔ ان کی ہر لرزش جھنکار بن کر فضا کو مرتعش کرتی ہوئی چھوٹی چھوٹی لہروں کی صورت میں دل پر چھائے جا رہی تھی۔ ننھی ننھی ہرالسنوں گدگدیاں سی دماغ کی رگوں میں رنگینی احساس کو ڈبو کے دے رہی تھیں۔ اور راج ___؟

راج بے حس تھا مگر معلوم ہوتا تھا۔ اس کا وجود ناچ رہا تھا اس کی آنکھیں تھرک رہی ہیں اور تھوڑی دیر کے لئے مجھے ڈر لگنے لگا کہ کہیں یہ عوامی جھمیلہ مجھے پسند نہ آ جائے

کیا یہ بھی اسی کمپنی میں نوکر ہیں" ختم ہونے پر میں نے پوچھا۔

"نوکر نہیں۔ یہی مالک ہیں"

"بھر ہو لی گی" میں نے جل کر کہا "مگر چالیس روپیہ میں تو ....."

اور راج نے لمبا چوڑا لکچر دے ڈالا۔ نہ جانے کیا کیا۔ مگر میں سوچتی رہی پاگل ہیں یہ لڑکیاں۔ ذرا دیکھئے نا فلم میں کیوں نہیں چلی جاتیں۔ کیا ایک سے ایک ٹیڑھی تکونی بھینگی ہیروئین بھری پڑی ہے اور ایک سے ایک زیادہ کما رہی ہے۔

اور ان چھ لڑکیوں کی حماقت سے مجھے لاکھوں کا قومی نقصان ہوتا نظر آیا۔ جبھی تو ہندوستان اتنا غریب ہے۔ حالانکہ بائی کو دیکھئے خدا کے فضل سے آج اپنی ذاتی کمپنی کی مالک ہیں۔

اس کے بعد "مقدس رقص" شروع ہوا۔ ارے ذرا اچھا بھلا رقص کا فن جانتے ہوئے یہ لوگ اتنے احمق کیوں ہیں؟ کم از کم یہ رقص تو کسی طرح بھی معمولی نہ تھا۔ یہ دیکھ کر کچھ ہتک سی محسوس ہوتی کہ اس عوامی تھیٹر میں اس قدر شاندار فن کہیں سے اڑا لیا گیا ہے۔ کس قدر دسترس ہے۔ اور وہ کمبخت طوطے کی شکل والا تو کیا جسم کو مروڑتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کوئی اٹھا اٹھا کر پٹخنیاں دے رہا ہے اور اس جسم کے پرزے اڑے اور رباب اڑے۔

میں تو پختہ ارادہ کرکے آئی تھی۔ کہ یہ پست طبقے کا تماشہ پسند کرنا ایک سرے سے مجھے راس ہی نہیں۔ میں اسے سراسر تضیع اوقات سمجھتی ہوں۔

"یہ کون ہے دھوبی کی شکل کا۔"

"ہُنہ یہ بتوٹے ہیں" راج نے ایک لمبا سا لکچر پھر شروع کر دیا اور میں ہنسنے لگی۔ کتنی مضحکہ خیز شکل ہے معلوم ہوتا ہے کلوا دھوبی نے گاندھی جی کی آنکھیں چرا کر لگالی ہیں۔ جب گاتا ہے تو اور بھی غیر انسانی سا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر نغمہ کی باریک لڑیاں بکھر جاتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے گلے میں تو سازوں کا خلاصہ نچوڑ کر بھر رکھا ہے۔

"یہ کون ہے گول مٹول ریوڑی سی"۔

"یہ پرتی سرکار ہے" راج نے اس قدر میٹھی مسکراہٹ سے کہا کہ میرا جی کڑوا ہو گیا۔ میں سوچنے لگی۔ راج کو آج ہی وہ سونے کے بٹنوں کا رسٹ پر بندنٹ کرنا پڑے گا۔

"اور وہ کون ہے؟" میں نے کیوپڈ جیسے گھنگھر یالے سر اور مونالیزا جیسی آسمانی مسکراہٹ میں ڈوبے ہوئے چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔

"یہ ردتی داہے۔ اودے شنکر کا چھوٹا بھائی"۔ اور میں سوچنے لگی کہ اودے شنکر کا پورا خاندان کسی مہلک مرض میں مبتلا معلوم ہوتا ہے۔

اور یہ ہر ساز سے مذاق کر رہا ہے ابھی طبلہ ہے تو ذرا سی دیر میں ستار اور دو گھڑی بعد جھانجھ سے چھیڑ چھاڑ اور پھر بانسری سے چٹخارے۔ آدمی ہے کہ سازوں کا جمعدار۔ توبہ۔

ہاں تو بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ میں کیا کہہ رہی تھی جی کہ وہ لال چیونٹے۔ مجھے احمق نہ سمجھئے میں اوٹ پٹانگ کہنے کی عادی نہیں پروگرام کا آخری حصہ شروع ہوا۔ اختتام پروہی بھولی بسری دہکتی ہوئی سنسان دوپہر جب میں پکے آموں کے لالچ میں پیڑ پر چڑھ گئی تھی اپنی پوری ہولناک تباہیوں کے ساتھ دہرائی جانے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے لال چیونٹوں کی فوج نے دل و دماغ پر سنہ ۱۸۵۷ بول دیا۔ بھیجے کی رگوں میں ڈنک سے چبھے اور زہر پھیلتا چلا گیا۔ ہوا میں چاروں طرف سے بھنبھناتی چانٹے گھومنے لگے۔ احساس پٹاخوں کی طرح چٹخنے لگا۔ جونہی پردہ گرا

میں نے اپنے آپ کو ٹیکسی میں ہانپتے کانپتے ڈرائیور کو جلدی چلنے کی التجا کرتے پایا جیسے میرے پیچھے بھوتوں کے غول کے غول بھاگے چلے آ رہے ہوں۔

وہ دن اور آج کا دن خواہ کچھ بھی ہو۔ کتنی بھی اُداسی اور تنہائی چھائی ہوئی ہو۔ زندگی کتنی بھی سُستی سے گھسٹ رہی ہو میں اپنے پُرامن بِل سے نہیں نِکلتی۔

اور آج میں نے سوچا کہ میرا فرض ہے خلق خدا کے بھلے کے لئے آگاہ کر دوں۔ اور آپ کو خدا کی قسم یہ مضمون ضرور پڑھئے گا۔ اس سے لاکھوں کا بھلا ہوگا۔ دیکھئے وہ جو میں نے زمانۂ ماضی میں چند احمقانہ چیزیں لکھ دیں انہیں بھول جائیے۔ اب میری کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ اور لوگوں کی فلاح و بہبودی ہی میرا دین و ایمان ہے لہٰذا جاگئے اور کانوں سے روئی کی گولیاں نکال پھینکئے ہتھیار اٹھائیے اور جی توڑ کر دشمن کا مقابلہ کیجئے۔ ورنہ وہی ہوگا جو روس میں ہوا۔ اور جس کے خلاف تمام مہذب قومیں ہتھیار اٹھا چکی ہیں۔ اور اٹھا رہی ہیں اور ابد تک اٹھاتی رہیں گی۔ اٹھئے اور ان مہذب قوموں کا ساتھ دیجیے۔ ورنہ یہ برسوں کی گھنی گھنائی تہذیب کا نظام ڈگمگا جائے گا۔ یہ صدیوں کے مقدس اصول بکھر جائیں گے۔ عرشِ تمدن کے کنگورے اپنی جگہ چھوڑتے جا رہے ہیں علم و ہنر کو عوام کے غلیظ پیروں تلے کچلنے کے لئے پھینکا جا رہا ہے۔ یہ لال چیونٹے دبے پیر سرحد کاٹے دھاری دار نیزوں جیسے ڈنک بڑھائے چپکے چپکے ہمارے نظام کی طرف رینگ رہے ہیں آنکھ بچی تو یہ غلیظ سڑکوں کے کیڑے جسم کو چاٹ کر کھوکھلا کر ڈالیں گے یہی ناچ رنگ، جو آج یہ لوگ تماشہ کہہ کر دکھا رہے ہیں ایک دن ننگی کا ناچ نہ نچاوے تو میرا نام پلٹ کر رکھ دیجئے گا۔ اس تماشہ کے خاتمہ پر جو کچھ میں نے دیکھا وہ حقیقت کا لباس نہ پہن لے ورنہ یقین مانئے جارجٹ اور مخمل خواب ہو جائیں گے اور شرفا بھی عوام کی طرح ننگے ہو جائیں گے۔ دیکھئے نا ہماری ملوں میں اتنا کپڑا کہاں سے آیا کہ یہ اتنے ننگے جسم ڈھانپ دیئے جائیں اور اگر کوشش بھی کی گئی تو رہی سہی شرافت بھی خاک میں مل جائے گی۔ یہ جو دو چار بچارے نوش پوش ملک اور قوم کی عزت بنائے بیٹھے ہیں یہ بھی نہ رہیں گے۔ وہی گاڑھا گزی باہر والے پہنیں گے۔ وائٹ اوے کا کیا ہوگا؟ ویسا مل اور بھگوتی مل کہاں جائیں گے؟ اگر آپ یونہی سوتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ دیکھئے یہ لال چیونٹے ابھی ایک باریک سی قطار میں گذر رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ چپکے چپکے یہ قطار قطاروں میں تبدیل ہو جائے۔

گو یہ تو اطمینان ہے کہ ان کی پہنچ اسکولوں میں نہیں۔ اور ہمارے بچے مزے سے صحیح تاریخ رٹ رٹ کر بڑے بڑے عہدے حاصل کر رہے ہیں۔ ان کا اخبار نہ ہی دلچسپ اور نہ چٹپٹا۔ خشک کا غذی جلینبھڑا جس کی اشاعت مست قلندر سے دس گنی کم ہے جو اتنا ردی چھپتا ہے کہ ردی کاغذ کی جگہ استعمال کرو تو کالک چھوٹنے لگتی ہے مگر یہ نئی چال جو عوامی تھیٹر کی آڑ لے کر چل رہے ہیں۔ کافی دیر سے زیادہ خطرناک ہے۔ ذرا چھچھورا پن دیکھئے ان کا۔ تماشہ کہہ کر ڈگڈگی بجا کر بلاتے ہیں۔ اور وہاں خود آپ کا بھیانک اور مضحکہ خیز ہیولہ بنا کر نچانے لگتے ہیں۔ ذرا سوچئے رقص، دیوتاؤں کی ودیا ہے کیا یہ جائز ہے کہ اسے تاریخ کا کچومر بنانے کے لئے لپیٹ کیا جائے اور ہندوستان میں صاف ان لوگوں نے یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ انگریز بحیثیت سوداگر آئے اور چٹکیوں میں ہندوستان کا سودا کر بیٹھے۔ حالانکہ میں نے آٹھویں جماعت میں صاف صاف، پڑھا تھا کہ بیچارے انگریزوں نے کافی سے زیادہ انکار کیا مگر مجبوراً انہیں دے دے کر ہندوستان ان کے سر منڈھ دیا گیا۔ سو غریب اسے اب تک بھگت رہے ہیں حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ یہ کتنی شریف اور راست باز قوم ہے ہندوستان کی خاطر یہ لوگ کیا کیا دکھ نہیں اٹھاتے حضور گورنر جنرل اپنا اچھا خاصہ ملک اجاڑ کر یہاں دوزخ جیسی گرمی برداشت کرنے تشریف لاتے ہیں یہ کیا کچھ کم ہے اور پھر ماؤ پیاں کھانے اور گوٹے کے ہار پہننے کے لئے کتنی دور جانا پڑتا ہے۔ بچیاری ملکہ وکٹوریہ تو خود دلی تک آ گئیں۔ چیلوں کے بیٹھنے کے لئے اور اپنا مجسمہ تک لگوا دیا۔ اور اس سے زیادہ کوئی کر بھی کیا سکتا ہے

خاص طور پر ایسے ٹھنڈی ملک کے لئے جہاں لوگ زبردستی کال ڈالنے کے عادی ہوں۔ اب یہی دیکھئے نا بنگال میں لاکھوں مر گئے مگر کاہلوں سے اتنا نہ ہو سکا کہ کما کھاتے۔ اور تو اور سنا ہے ہوٹلوں کے باہر پڑے مرتے رہے اندر جانے کی تکلیف گوارا نہ کی۔ کیا کلکتے میں ہوٹلوں کی کمی ہے؟ بھئی یوں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہو گے۔ تو آپ کو بھوک لگے گی۔ کنواں پیاسے کے پاس جاتا ہے یا پیاسا کنویں کے پاس اور وقت کی پابندی تو ہم ہندوستانیوں کو کبھی آئی اور نہ آئے گی۔ وقت پر نہ کھانے سے بھوک بھی مر جاتی ہے اور بھوک مر جانے سے آدمی آپ ہی مرے گا۔

اگر آپ نے اس زمانے میں ذرا سا بھی فائدہ کمایا ہے تو آپ قطعی یہ تماشہ نہ دیکھنے جائیے گا۔ خواہ مخواہ ان لوگوں کی بدمذاقی کی وجہ سے آپ کے دل کو ٹھیس لگے گی۔ بدحاسد کسی کا فائدہ ہوتے نہیں دیکھ سکتے کسی نے محنت مزدوری سے چار پیسے کمائے اور ان کے کلیجے میں آگ لگی۔ اور یہ دنیا کا قاعدہ ہے کہ زیادہ تر معصوم منافع خوروں کو ہی بدنام کرتی ہے۔ لوگ انہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اب یہی دیکھئے نا اس ہزار کے نوٹوں والی بدمذاقی میں سوائے کنگال اور بھک منگوں کے اور کون پھنسا ہوگا۔ بیچاروں کو ہزار ہزار کے نوٹ چار چار تین تین سو میں بیچنا پڑے۔ ذرا حساب لگائیے تو معلوم ہوگا۔ کہ ایک کنگلے کو کم از کم لاکھوں کا نقصان اٹھانا پڑا۔ اور پھر لوگ شور مچاتے ہیں کہ ہندوستان میں گداگری کی لعنت ہے۔

یہ لوگ ہاتھ دھو کر کالے بازار کے پیچھے پڑے ہیں۔ بزنس کی ہو تو کالے گورے کا پتہ چلے۔ یہ بزنس مذاق نہیں کہ اٹھے اور ناچنے لگے۔ اکنومکس کے بارے میں الف کے نام لٹھ نہیں آتا اور چلے ہیں تنقیدیں کرنے۔ یہ تو شاید بالکل ابتدائی جماعتوں میں سکھایا جاتا ہے کہ رسد کم ― مانگ زیادہ۔ مانگ کم رسد کے پو بارے۔ ایک عقلمند انسان چاہے تو ایک من چاول سے اتنا کما سکتا ہے کہ ایک احمق ایک من سونے سے بھی نہیں کما سکتا صاحب! یہ تو بزنس کے گر ہیں۔ اگر ہمارے قوم کے بیوپاری اس وقت رسد کنٹرول نہ کرتے تو آج اتنی اطمینان بخش مانگ ہرگز نہ ہوتی۔ اجی یہی چاول بھوسے کے بھاؤ بکتا۔

اگر آپ یونہی غافل رہے تو وہ دن دور نہیں جب ہندوستان میں بھی وہی ہوگا جو دوسرے ذلیل ملکوں میں ہو رہا ہے۔ خواہ آپ کو کتنی بھی سستی سنا رہی ہو۔ کام ضرور کرنا پڑے گا ملک کے پیارے بچے یتیم خانوں میں چلے جائیں گے۔ اور بیوی سرکار نہ طوائف بن جائے گی۔ جی ہاں یہی ہوگا۔ چاہے پوچھ لیجئے بڑے بڑے لیڈروں سے سب یہی کہتے ہیں۔ اور کیا! اور میں کہے دیتی ہوں کہ یہ لال جھنڈے تہذیب اور تمدن ہی نہیں بلکہ موجودہ سرکار کے خلاف بھی لوگوں کو بھڑکاتے ہیں۔ یہ سب انگریزوں کے پٹھو ہیں۔ آہنہ پتہ نہیں ہمیں یہی کہتے ہیں لوگ کہ سرکار برطانیہ نے بڑے عزو خوض کے بعد ان لوگوں کو اپنے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ کیا پتہ بھئی! لوگ یہی کہتے ہیں کچھ ہوگا جبھی تو دنیا کہتی ہے بڑے بڑے لیڈر کہتے ہیں تو کیا خدانخواستہ مذاق کرتے ہیں۔

یہ میل کے قائل ہیں۔ صاف بات اس گھسں کی گرمی میں تو میں کسی سے ملنا حماقت سمجھتی ہوں۔ کہاں یہ کہتے ہیں ایک ہو جاؤ! ذرا سوچئے اگر ایک موٹے سے بنئے میں ایک سوکھا مارا مسلمان گھول دیا جائے تو کتنا بڑا ڈھیر ہو جائے گا۔ ابل نہ پڑے گا مادہ؟ اس گرمی کے موسم میں چپچپاتے پسینہ میں غرق ― جی چاہتا ہے بس چلے تو اپنے ہی جسم کو چیر کر آدھا کر ڈالیں۔ نہیں بھئی میں کچھ سچ سے بہت ڈرتی ہوں۔ دوسرے ہندو مسلمان کا جوڑ ہی کیا۔ بھلا آگ اور پانی کا بھی میل ہو سکتا ہے۔ اگر مل بھی جائیں تو نتیجہ؟ بھاپ! اللہ توبہ بھاپ کی سینہ زوری سے کون واقف نہیں۔ اس ٹھنڈے انجن میں بس بھاپ کی کسر ہے اگر غلطی سے پوری ہو گئی تو بس لوگ منہ پھاڑے دیکھتے رہ جائیں گے۔ اور یہ ہیبت ناک انجن اس جگمگاتی دنیا کو روندتا سرمست ہاتھی کی طرح روندتا اللہ جانے کہاں جا کر دم لے گا۔

لہٰذا ابھی وقت ہے جاگئے اور اپنی پوری طاقت لگا کر اس خونی فرقے کا مقابلہ کروائیے۔ ان کے بل معلوم کیجئے اور تیز سے تیز

فلٹ کا نسخہ ایجاد کر کے استعمال کیجئے۔ یہ ویسے نہ ملیں گے۔ ان جراثیم کی تلاش میں آپ کو اچھے بھلے تندرست جسم چیرنا پڑیں گے۔ ہزاروں ناموں اور کاموں کی آڑ میں چھپے یہ اپنا زہر پھیلا رہے ہیں۔ کہیں یہ اخباروں کے اوراق میں دبکے بیٹھے ہیں۔ تو کہیں ادب کی ٹٹی کی آڑ لے رکھی ہے، کہیں تھیٹروں کا ڈھونگ رچائے نرت اور سنگیت کے ذریعے کانوں میں زہر گھول رہے ہیں۔ تو کہیں پردۂ سیمیں کے پیچھے سماج کے حق میں دیمک بنکر رینگ رہے ہیں۔

انہیں ڈھونڈھ نکالئے۔ ہوشیاری سے نتھنے پھیلا کر سونگھئے ان کی بو اندر ملک کے کونے سے خود دوڑی آئے گی۔ اور بس ناک کی سیدھ میں دوڑ کر انہیں پکڑ لیجئے اور پھر...... انجمنیں قائم کیجئے، جلسے کیجئے، لکھ دیجئے، ریزولیوشن پاس کرائیے، ان کے خلاف پروپیگنڈے کا ایسا جال پھیلائیے۔ کہ قدم قدم پر منہ کے بل گریں۔ ان کے اخبار جلا دیجئے، پریس بند کر دیجئے، ان کی پیشانیوں پر سرخ لوہے سے بالشویک داغ دیجئے، یہ سب بالشویک ہیں گویا جانتے نہیں۔ ان کی تحریروں پر دفعات لگائیے، مقدموں کے ذریعے ہتھیاں دے کر پسٹ کروائیے، تاج شاہی کی مدد لے کر کچہریوں میں گھسیٹئے، اور یہ بہانے ملیں جب ملیں ان کو تباہ کر دیجئے۔ اگر غلطی سے یہ عوامی تھیٹر آپ کے شہر میں پروگرام پیش کرنے آئے تو تمام با اثر روساء، علمائے دین اور سرکاری افسروں کی مدد حاصل کر کے اس کا مقصد تہ و بالا کر دیجئے، ہال کے باہر پکیٹنگ کیجئے۔ اور اندر دنگا مچائیے، اسٹیج پر اینٹیں پھینکئے اور اتنا ادھم مچائیے کہ طبل جنگ کی پکار وہیں ہیبتم مردہ ہو کر سسکنے لگے ورنہ یاد رکھئے اگر یہ خونی گرج ایک بار بھی پردے کچے کانوں میں گونج گئی تو وہ اسے برداشت نہ کر سکیں گے۔ اور آج جو تلاطم میں نے راج کے سینے میں مچلتے دیکھا ہزاروں معصوم سینوں کو تہ و بالا کر دے گا وہ ننگی تلوازیں جو آج میں نے راج کی آنکھوں میں ناچتی دیکھیں لاکھوں شریف آدمیوں میں جگمگا اٹھیں گی۔

میں آپ کو بتائے دیتی ہوں کہ یہ بات ہنسی میں ٹالنے کی نہیں ایسا نہ ہو کہ اس وقت تو آپ مجھ کو احمقوں کی فہرست میں لگا دیں اور پھر ایک وقت ایسا آئے کہ آپ کو دست تاسف ملنا پڑے پھر کچھ نہ ہو سکے گا۔ چڑیاں کھیت کا کھلیان کر چکی ہوں گی اور وقت لہراتے ہوئے سانپ کی طرح بغیر لکیر چھوڑے بھاگ چکا ہوگا۔ پھر اس وقت آپ کتنا ہی پچھتائیں، نادم ہوں، مجھے یاد کریں، میرا مجسمہ بنوا کر بیچ شاہراہ عام پر کھڑا کر دیں۔ کچھ بھی نہ ہوگا کیونکہ دیکھئے اگر یہ لال چیونٹے موجودہ نظام کے جسم کو ایک دفعہ لپٹ گئے تو اس جنم میں تو نہ چھوڑیں گے۔ اور پھر یہ بھیانک زخم کسی مرہم سے پر نہ ہو سکے گا۔

لیکن اگر عوامی تھیٹر کسی نہ کسی طرح اپنا پروگرام دکھانے پر تل ہی جائے تو خبردار ٹکٹ ہرگز نہ خریدیے گا۔ اور نہ کسی کو خریدنے دیجئے گا۔ ہاں اگر مفت کا پاس مل جائے تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ پروگرام ان کمبختوں کا واقعی ذرا دلچسپ ہے۔ خاص طور پر پرتی سرکار کی روپہلی ندی کی طرح لہراتی، بل کھاتی تھرکتی، اٹھلاتی آواز، بنو کے کی اتھاہ سمندر جیسی گہری گونجتی گرجتی۔ ابھرتی۔ ڈوبتی تانیں، اور ریبا کی برساتی جھرنوں کی طرح چھم چھم کرتی میٹھی میٹھی مرکیاں تھوڑی دیر کے لئے انسان کو .... لاحول ولا قوۃ میں پروگرام پسند کرتے کرتے بچی!

(ماخوذ)

عوامی تھیٹر!

عوامی فلم!!

عوامی ادب!!!

عوام کو اونچا اٹھاتے ہیں

احمد ندیم قاسمی

عقیدے

اپنے ماضی کے گھنے جنگل سے

کون نکلے گا کہاں نکلے گا! بے کراں رات، ستارے نابود

چاند ابھرا ہے، کہاں ابھرا ہے؟ اک فسانہ ہے تجلّی کی نمود

کتنے گنجان ہیں اشجارِ بلند کتنا موہوم ہے آدم کا وجود

مضمحل چال، قدم بوجھل سے

اپنے ماضی کے گھنے جنگل سے

× × × × × × × × × × × × ×

مجھ کو سوجھی ہے نئی راہ فرار آہن و سنگ و شرر برسائیں

آؤ اشجار کی بنیادوں پر تیشہ و تیغ و تبر برسائیں

اک تسلسل سے ہم اپنی چوٹیں بے خطر بارِ دگر برسائیں

ذہن پر چھائے ہیں یوں بادل سے اپنے ماضی کے گھنے جنگل سے

نوعِ انساں کو نکلنا ہوگا

اس اندھیرے کو نگلنا ہوگا

پیراشر

سنہ ۱۹۴۶ء کی فلمیں

کیا فلم انڈسٹری کا مستقبل روشن ہے؟ ایک جواب "ہاں" بھی ہے۔ یہ کوئی خدشے کی بات نہیں۔ کہ ہمارا نظریہ تاریک ہو۔ سرمایہ لگانیوالے بڑی تیزی سے اپنا روپیہ جھونک رہے ہیں۔ ملک میں کتنے ہی بھیانک فساد ہو رہے ہوں۔ اور سیاسی تنازعے کیسے ہی کیوں نہ ہوں فلمی صنعت ضرور ترقی کرے گی۔ میری یہ رائے میری ذاتی معلومات اور فلمی صنعت کے عوامی مفاد کی بنا پر ہے۔ میدان جنگ میں انگلستان، فرانس اور دوسرے مقبوضات کو بھی اس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بھی انہیں مخدوش حالات میں سے گذر کر ترقی کی جانب قدم بڑھا چکے ہیں۔ اسی طرح میں بھی سچائی کے ساتھ محسوس کر رہا ہوں۔ کہ ہندوستانی فلمسازی بھی یورپی ممالک کے مقابلے پر زیادہ خوبیوں اور اچھائیوں کے ساتھ اس عبوری دور کی ... سے نکل آئے گی۔ فلم، ہندوستان کی تفریحی زندگی کا ایک اہم جزو بن چکی ہے ہمارے ہاں سوائے سینما کے کوئی بھی کامیاب تفریح گاہ۔ ناچ گھر، یا تھیٹر ہال نہیں ہے جو سینما کے مقابلے پر ہمارے لئے تسکین وہ ثابت ہو سکے۔ ایسے حقائق کی روشنی میں وہ لوگ قابل رحم ہیں۔ جو فلم کو تضیع اوقات سمجھتے ہیں.......... اور فلمی صنعت کی موت کی توقع باندھ بیٹھے ہیں۔

ان کیلئے میرے پاس صرف ایک جواب ہے کہ ہاں یہ موت ضرور واقع ہوگی لیکن یہ موت ایک نئی زندگی کا پیش خیمہ ہوگی۔ اس دور کی موت جو "خزانچی" اور "کنگن" سے شروع ہوا۔ اس نئی زندگی کا آغاز جو "ہمراہی" سے ہوا جسے "ڈاکٹر کوٹنس" نے تقویت پہنچائی۔ اور "دھرتی کے لال" نے اس کی بنیادیں مضبوط کر دیں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ اس مرتے ہوئے دور نے مالی منافع کے انبار لگا دئے۔ اور فلمی صنعت پر چھائے ہوئے سرمایہ داروں نے کروڑہا روپے کما لئے۔ جب یہ سرمایہ دار طبقہ اس طرح لوٹ کھسوٹ کر رہا تھا۔ تو وہ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ اب عوامی رجحانات میں جاگرتی پیدا ہو گئی ہے۔ اور زندگی کی غلط قدروں کے خلاف ایک طوفان اٹھ رہا ہے۔ چنانچہ کچھ فلمسازوں نے یہ محسوس کیا۔ کہ اب ایسی چیزیں پیش کرنی پڑیں گی۔ جو آزادی کی طرف بڑھتے ہوئے عوام کا ساتھ دے سکیں۔ ایسی فلموں کی ابتدا نیو تھیٹرز کے "ہمراہی" سے ہوئی۔ جس کو باوجود چند ضمنی نقائص کے فلمی نقادوں اور فلم بینوں نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ کلکتے سے آئے ہوئی اس فلم نے نہ صرف فرسودہ طریق کار کو بدل دیا۔ بلکہ ایک نئی تحریک کا سنگ بنیاد بھی رکھ دیا۔ آپ اسے ایک انقلاب کہہ سکتے ہیں۔ اس پہلی انقلابی فلم نے بمبئی کے فلمسازوں کی آنکھیں کھول دیں۔ اور انہیں احساس ہونے لگا۔ کہ ایسی نئی چیزیں بھی مالی کامیابی کا باعث بن سکتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اس ہنگامی بے خلوصی کی بدولت ترقی پسندانہ نقطہ نگاہ کی طرف قدم بڑھایا گیا۔ فلمستان نے "مزدور" بنا کر اس نقطہ نگاہ کا آغاز کیا یہ فلم کمپنی ہزارہا روپے صرف کر کے "چل چل رے نوجوان" کی ناکامی کا منہ دیکھ چکی تھی۔ "ہمراہی" نے ایک نیا رستہ دکھا کر انہیں "چل چل رے نوجوان" کی تلافی کرنے کے لئے "مزدور" بنانے پر مجبور کر دیا۔ لیکن یہاں بھی ناکامی نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اسی طرح دوسرے فلمسازوں نے بھی "ہمراہی" کی تقلید میں اپنا اثاثہ لٹا دیا۔ مگر "مولوی مدن" کی سی بات پیدا نہ کر سکے۔ چہ جائیکہ یہ بیچارے غیر شعوری طور پر نئے نقطہ نظر کا ساتھ دے رہے تھے۔ پچھلے دنوں برطانوی سامراج کے خلاف عوامی طبقوں کے جو کامیاب مظاہرے ہوتے رہے۔ مثلاً "آزاد ہند فوج کے واقعات"۔ جہازی مزدوروں کی بغاوت اور مزدوروں، کسانوں کی ہندوستان گیر ہڑتالیں۔ ان کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ عوام ایسی فلموں کو زیادہ پسند کرنے لگے جو آزاد منش رہے۔ جو ان کے سامراج دشمن جذبے کی تسکین کا باعث

بن سکیں۔ فلمسازوں نے اس جذبے کی اہمیت کو سمجھ کر "زنجیر"، "۱۸۵۷ء"، "اگست" اور "بھوک" جیسی عوام پسند فلمیں بنانے کا اعلان کر رکھا ہے چونکہ یہ تصویریں ابھی تک صرف اعلان تک محدود ہیں۔ اس لئے ان پر تنقید تبصرہ کا ابھی وقت نہیں آیا۔ میری رائے میں اب ہلکی قسم کی رومانی اور تصویریں اور زندگی کو سُلا دینے والی فلمیں بنانا۔ روپے کا غلط اور مضر استعمال ہے۔ ہمارے پڑھے لکھے عوام نے غیر ممالک کی زندگی بخش اور وطن پرستانہ نقطۂ نگاہ پیش کرنیوالی فلمیں دیکھ کر شدت سے محسوس کیا۔ کہ حب الوطنی کتنی زبردست اہمیت رکھتی ہے۔ اس رجحان کی موجودگی میں یہ امر کوئی تعجب خیز نہیں ہے کہ "بمبئی ٹاکیز" کے روایتی رومانی فلمی دور کا خاتمہ ہو جائے۔ اور "فلمستان" جو بمبئی ٹاکیز کے اس غلط اور رجعت پسندانہ اصول کا سہارا لے کر میدان میں اترا تھا۔ نہ صرف لکھوکھا روپوں کی قربانی دینے پر مجبور ہو گیا۔ بلکہ اپنی رہی سہی مقبولیت بھی کھو بیٹھا ـــــ اگرچہ اس کا یہ مطلب بھی نہیں۔ کہ اخلاق سوز اور گھٹیا فلمیں بننا بند ہو گئی ہیں۔ بلکہ اس کی ایک کامیاب مثال واہیات، رجعت پسند، غیر عوامی، لچر اور بازاری توجہات کی فلم "رتن" ہے۔ جو زہریلے نشے کا سا اثر رکھتی ہے۔ یہ فلم خوب کامیاب ہے اور کامیابی اس لئے نہیں، کہ اس میں فنی گہرائیاں یا زندگی بخش نظریئے پیش کئے گئے تھے۔ بلکہ صرف اس لئے کہ اس کی چند عوام پسند دھنیں، ایک کمزور کہانی کے ساتھ منسلک کر دی گئی تھیں۔ البتہ "رتن" نے یہ ثابت ضرور کر دیا۔ کہ ہمارے عوام میں صحیح تنقیدی صلاحیت کس قدر کم ہے۔ لیکن ہم اپنے ساڑھ فیصدی غیر تعلیمیافتہ عوام سے اس سے زیادہ اور توقع بھی کیا کر سکتے تھے اور پھر ہماری مہربان سامراجی حکومت نے "عالم آرا" سے لیکر "رتن" تک اپنی اس اندرونی سیاسی پالیسی پر بھی متواتر عمل کیا۔ کہ آزادی پسند فلموں کی نشر و اشاعت کو حتی الامکان روکا جاتا رہے۔

ترازو کے ایک پلڑے میں "رتن" کو رکھنے کے بعد اب دوسرے پلڑے میں سال رواں کی کامیاب فلم "ڈاکٹر کوٹنس" کو رکھ دیجئے جسے ہم فلمی صنعت کی ایک عظیم ترین پیش کش کہہ سکتے ہیں۔ یہ حقیقی زندگی کی ایسی تصویر ہے جو وقت کی صحیح ترجمانی کرتی ہے جو بین الاقوامی اشتراک کا مقصد لے کر اٹھی ہے۔ اور جو دنیا کی بہترین اور ترقی پسند فلموں میں شمار کی جا چکی ہے۔

مجھے آپ چاہے شانتارام کا زر خرید غلام کہہ دیں۔ لیکن میں اپنی پوری دیانت اور شدت کے ساتھ تمام ہندوستانی فلم ڈائرکٹروں سے کہوں گا۔ کہ وہ اس فلم کے ایک ایک ٹکڑے کو دیکھیں

اب ذرا اور آگے بڑھئے۔ اور ایک اور قابل توجہ عوامی فلم پیپلز تھیٹرز کی پیش کش "دھرتی کے لعل" کی طرف آیئے۔ جس نے مجھ میں یہ احساس پیدا کیا۔ کہ ہمارے عوام، اچھی فلموں کی قدر کرنے کے بھی اہل ہو چکے ہیں۔ پیپلز تھیٹر یہ دعویٰ نہیں کرتا۔ کہ وہ فنی تجربے کا مالک ہے۔ لیکن اس نے پھر بھی قوم کا رجحان بدل کر رکھ دیا۔ ڈاکٹر ملک راج آنند نے ٹھیک کہا ہے۔ کہ اس کا مقابلہ مشہور امریکن فلم The Grapes of Wrath سے کیا جا سکتا ہے "ایسی فلم کے بنانے کا حق صرف ہندوستان کو ہی حاصل تھا۔ اور ایسی فلم تجارتی ادارے یا چابکدست ماہرین ہی نہیں بنا سکتے۔ بلکہ ان روپوں کا گروہ ہی ایسی تخلیق پیش کر سکتا ہے۔ جو ایک مشترکہ نظریہ لے کر میدان میں اترے ہیں" ـــ

یہ حقیقت اس فلم کی اہمیت کا ثبوت ہے۔ کہ اسے ان غیر ملکی نامہ نگاروں نے بھی پسند کیا ہے۔ جو شہنشاہ پرست قوتوں کے نمائندہ تھے اور جنہیں اس فلم کے اشتراکی نقطہ نگاہ میں شہنشاہیت کے خلاف ایک زبردست جذبہ دکھائی دیتا تھا۔

سال رواں کی یہ دو تصویریں فلمی صنعت کے لئے ایک حیرت انگیز اقدام کی حامل ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ دونوں فلمیں ان لوگوں کے لئے مشعل راہ کا کام دیں گی۔ جو ترقی پسند نظریوں پر فلمیں پیش کرنے کے لئے مضطرب تھے۔ اگرچہ لاہور میں انکی ناکامی کی وجہ حد درجہ صحیح قسم کی پبلسٹی کا فقدان تھا۔ لیکن بمبئی میں کامیاب صحیح پبلسٹی کی وجہ سے کامیاب رہی۔ فلمی دنیا میں ترقی پسند ادیبوں مثلاً چیتن آنند۔ کرشن چندر، ہرندرناتھ چٹوپادھیائے اودے شنکر جوش ملیح آبادی۔ ساحر لدھیانوی۔ ابراہیم جلیس۔ اپندرناتھ اشک احمد ندیم قاسمی اور تیتل شتائی وغیرہ کا داخلہ ہمارے اس دعویٰ کا ثبوت ہے۔ ان ادیبوں نے، جن میں ڈائرکٹر، پروڈیوسر، شاعر

مکالمہ نویس اور افسانہ نگار ہیں۔ فلمساز سیٹھوں کو مجبور کر دیا۔ کہ وہ عوامی رجحانات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے فلمیں بنائیں۔

ان دو تصویروں کے علاوہ جو ایک مخصوص مقصد کے تحت بنائی گئیں۔ چند ایک اور قابل ذکر تصویریں بھی پیش کی گئیں۔ ان میں ایسٹرن آرٹ کی "زینت" اور مرزا کی "شمع" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ بظاہر یہ مسلم معاشرت تک محدود ہیں۔ لیکن ان کی کہانیوں میں ایک ایسی ڈرامائی خوشگواری موجود ہے۔ جو ہندو تہذیب و تمدن پر بھی اثر ڈالتی ہے۔ دونوں اداکاری، مکالمہ نگاری، موسیقی، ہدایت کاری اور افسانوی اعتبار سے گوارا کہی جاسکتی ہیں۔

ان دو تصویروں سے ذرا ہٹ کر ایک، اور تصویر پربھات کی "ہم ایک ہیں" بھی پیش کی گئی۔ جس میں حب الوطنی کے جذبہ کی نشوونما کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دھار مک فلموں میں پیر زلا رائے کی "سبھدرا" گھٹیا درجے کی فلموں میں سب سے زیادہ گوارا کہی جاسکتی ہے ——— سال رواں میں کوئی کامیاب تواریخی تصویر دکھائی نہیں دیتی۔ اور جو تصویریں بنائی بھی گئیں۔ انہیں ہم "ناکام ترین" کی ذیل میں شامل کر سکتے ہیں۔ اور یہ محسوس کیا ہے ہیں۔ کہ ہمارے پروڈیوسر آئندہ کئی سالوں تک ہندوستانی تاریخ کے شہنشاہوں، بیگموں، عمارتوں اور وزیروں کو اپنے مدفن میں آرام سے خواب شیریں کے مزے لینے دیں گے۔

سال رواں میں پرانے ڈھرے پر پیش کی جانے والی فلمیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ اس فرسودہ پسندی کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ ہمارے باقی پروڈیوسر اپنے قائم کئے ہوئے راستے کو بدلنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ نہ تو انہوں نے نئے نظریئے تلاش کرنے کی زحمت گوارا کی۔ اور نہ ہی نئے مصنفین کے خیالات کو فلمانے کی حامی بھری سال رواں میں جس رفتار سے سیاسی ترقی ہوئی ہے۔ اسی رفتار سے فلم پروڈیوسر پیچھے کی طرف اپنے قدم اٹھاتے رہے ہیں۔

سہگل کا مترنم گلا۔ تدبیر میں خورشید کے رقص کرتے ہوئے ہونٹ۔ "مہارانا پرتاپ" میں جمنا کی سنجیدہ اور موثر اداکاری۔ "امیری" میں رمولا کی زندگی بخش شوخی "البیلی" میں کانن بالا کے مسحور کن نغمے "بن پھول" میں ترقی پسند اداکار۔ پرتھوی راج دیوان میں اپنے نوشہ آپ مرکز رہ گئے۔ صرف اسی وجہ سے کہ یہ مانے ہوئے کامیاب اداکار ایسی فلموں میں پیش کئے جاتے رہے۔ جو نقطۂ نگاہ کی فرسودگی پر اپنی عمارت کھڑی کرتی رہی۔

موسیقی کے اعتبار سے سوائے "رتن" کے کسی فلم نے یادگار مثال پیش نہیں کی۔ اور پنجابی موسیقی کی انفرادیت تو سال رواں میں اپنا ایک سکہ بھی نہیں بٹھا سکی۔

فلمی میدانوں کے پرانے کھلاڑیوں میں جے شری۔ ڈاکٹر کوٹنس میں سورن لتا۔ دامنی عذرا میں نور جہان۔ زینت میں، مہتاب شمع میں۔ شاہنواز نرگس میں، الناصر شہر سے دور میں، یعقوب نیک پروین میں۔ اشوک کمار شکاری میں، اپنا سکہ ایک بار پھر بٹھا گئے ہیں۔

نئے کھلاڑیوں میں دمینتی ساہنی، مدراج۔ ترپتی، انور بے بی تبسم، مہندر ناتھ، ویرا، بادہ۔ رحمان، شوبھا نسرین اپنا علم اٹھاتے ہوئے آئے۔

تقریباً چار سو نئی فلموں کے اعلانات کئے جاچکے ہیں۔ جن کے متعلق یقین واثق ہے۔ کہ آدھی سے زیادہ فلمیں اپنے ناکام سرمایہ داروں کا نوحہ پڑھتے ہوئے ختم ہو جائیں گی۔

شاد عارفی

فلمی محبّت

خود گرا دی جائے گی کوئی کتاب ! آپ اُٹھا دینگے ۔ تو شکریّہ جناب !
مل گیا رستہ محبّت ٹھن گئی !
آپ ؟ واللہ ۔ کیا ہوا ؟ کیوں گر پڑے ؟ بچ گئے لاری سے ! کھمبے سے لڑے
ارے ! ادھر تانگہ ! محبّت ٹھن گئی !
کس لئے لیٹے ہوئے ہو خاک پر ؟ مکھیاں لپٹی ہوئی ہیں ناک پر
کس کے ، اِک بلّا ۔ محبّت ٹھن گئی !
ہال پر زن سے گئی موٹر نکل نصف ماتھے تک "کٹی چوٹی کے بل"
بس نہیں چلتا ۔ محبّت ٹھن گئی !
سائیکل ٹکرا کے "ساری" دھول پر گفتگو نرمی سے بڑھکر ، فول پر
پھر جو رُخ بدلا ۔ محبّت ٹھن گئی !
سیب سے رُخسار پہ مچھر ۔ ارے تِل ! مگر سرمے کا ہے ۔ رہیئے پرے
تھل گیا دھوکا ۔ محبّت ٹھن گئی !
بہہ رہا ہے ہوئے فشاں ہونٹوں سے زبون ہاں ! لپ اسٹک ! تو چھو کر دیکھ لوں
گال پر چانٹا محبّت ٹھن گئی !
ریل کی پٹڑی پہ یا دریا کے پاس "پھر رہی" یا "پھر رہے" ہیں کیوں اُداس
خودکشی ۔ توبہ ! محبّت ٹھن گئی !
بھوک سے تیری بہن ہے نیم جاں ! جو بھی مل جائے ابھی لاتا ہوں ماں !
کار سے دبنا ۔ محبّت ٹھن گئی !

پروڈیوسر مہندرا گل پیش کرتے ہیں۔
نئے سال کا نیا تحفہ
ڈائریکٹر
نرنجن
رقص:۔
آنت لعل گنگولی
موسیقی
لچھی رام۔ بجائی لال
گانے:۔ بیکل۔ سرشار سیلانی۔ راز ہاشمی۔
اداکاران:۔ چاندر ق پران۔ روفی۔ وشال پران۔ بمبئی
بینا۔ خورشید بیگم۔ بے بی شمشاد اور نرنجن
آخری مراحل تکمیل میں
تفصیلات:۔
مہندرا ایکچیرز رائل پارک لاہور
آئندہ پروگرام:۔
جنتا جاگی
ہدایت
مہندرا گل

ممتاز مفتی

مسرت کی جھلکیاں

مسرت ایک نفسی کیفیت ہے۔ مسرت کا احساس ہونے پر آپ کے دل و دماغ میں لطافت اور تازگی کی ایک لہر سی پیدا ہو جاتی ہے اور کچھ دیر کے لئے وجود پر چھا جاتی ہے۔ مغربی علما کا کہنا ہے کہ انسان کے دل پر خوشی کی نسبت غم زیادہ حاوی ہے۔ ہماری زندگی میں غم کا پھیلاؤ آسمان کی طرح ہے۔ جس میں یہاں وہاں کہیں کہیں مسرت کے لمحات درخشاں تاروں کی طرح وہ چمکتے ہیں۔ شاید یہ بات درست ہو۔ یا شاید یہ مقولہ محض علما کے محسوسات سے تعلق رکھتا ہو۔ جو زندگی کے گہرے مقاصد کو کماحقہ سمجھ چکے ہوتے ہیں۔ اور حقیقت کی غایت تک جانتے ہیں بہر حال دیکھنے میں آتا ہے کہ عام لوگوں کی زندگی میں مسرت کا جذبہ شاذ نہیں بلکہ عام ہوتا ہے۔ اور قدر عام کہ ہمیں شعوری طور پر اس کی آمد کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ کہ وہ بیت بھی جاتا ہے۔ جس طرح گرمیوں میں آپ دوپہر کے وقت قمیص اتار کر بیٹھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نیم خوابی۔ نیم بیداری کی سی کیفیت میں اپنے منہ سے مکھیاں اڑاتے رہتے ہیں اور آپکو احساس بھی نہیں ہوتا کہ آپ سونے کی کوشش کرنے کے علاوہ مکھیاں بھی اڑا رہے ہیں مثال کے طور پر آپ کارخانے کی طرف جا رہے ہیں۔ راستے میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک میٹار بڑے طمطراق سے آ رہی ہے آپ نے اس کی طرف دیکھا۔ اور ان جانے میں گھورا کر یا اس کے حسن سے متاثر ہو کر منہ کی بجائے اس کے پاؤں کی طرف دیکھنے لگے۔ دفعتاً اس کی راہ میں کھڑے مرغا مرغی کی طرف جھپٹ پڑتا ہے جانتی ہے یہ منظر دیکھ کر وہ ٹھٹک جاتی ہے۔ منہ سرخ ہو جاتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کدھر دیکھے یا اس کی مفت پریشانی سے کیسے نجات حاصل کرے۔ اس کی گھبراہٹ دیکھ کر آپ کے دل میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے جی چاہتا ہے چیخ چیخ کر کا ناشروع کردیں "لے دکھ تینوں نہیں دسیا؟"

اگرچہ یہ مسرت کا لمحہ آتا ہے اور جلد بیت جاتا ہے لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ آتا ہے۔ مانا کہ انبساط سے آپ کے ہونٹ کھلنے ہی نہیں پاتے کہ وہ بند ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کا بند ہونا ہی اسکا ثبوت ہے کہ وہ کھلے تھے۔ اخلاق پسند لوگ کہیں گے کہ ایسی بات پر خوشی محسوس کرنا گناہ ہے بلکہ ایسے وقت لاحول پڑھنا چاہیئے۔ مانا کہ یہ واقعہ اخلاقی خوشی پیدا نہیں کرتا لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ خوشی چاہے اخلاقی ہو روحانی ہو جسمانی ہو یا شیطانی ہر صورت میں خوشی ہوتی ہے اور جب وہ آپ پر حملہ کر دے تو آپ کسی صورت میں اپنا بچاؤ نہیں کر سکتے۔ کچھ لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں کچھ لوگ جو اخلاقی پسند نہیں کرتے منہ موڑ کر مسکرا دیتے ہیں۔ اکتفا کرتے ہیں۔ اور کچھ جو اخلاق کو دیوتا بنائے رہتے ہیں۔ دل میں مسرت کی ابھرتی رو محسوس کرتے ہیں اور پھر ان کی اس بغاوت کے خلاف لاحول کی تلوار سے جہاد کرتے ہیں۔ تینوں صورتوں میں خوشی کی رو اٹھتی ضرور ہے چاہے آپ اس کی آمد کو تسلیم کریں یا نہ کریں۔ یاد رکھیں یا بھول جاویں۔ اہمیت دیں یا نہ دیں۔

دس ایک قدم چلنے کے بعد آپ کو وہ میٹار اور مرغے قطعی بھول جاتے ہیں۔ نہ جانے آپ کس خیال میں چلے جا رہے ہیں۔ پھر جو آپ آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں آپ کے سامنے ایک معزز شخص اتنی سی بڑی توند کو بمشکل اٹھائے بڑے انداز سے موٹر سے نیچے اتر رہا ہے۔ جی ہاں۔ کیوں نہ ہو امارت کا نشہ ہے۔ حقارت سے آپ کے ہونٹ بٹوہ بن جاتے ہیں۔ ارے وہ اس کا پاؤں کیلے کے چھلکے سے پھسلا۔ کبھی کبھی بیساختہ آپکے منہ سے نکلتا ہے آپ کہیں گے کسی کو گرتے دیکھ کر ہنسنا نہیں چاہیئے مجھے آپ سے قطعی طور پر اتفاق ہے لیکن اگر یہ بات یاد آنے سے پہلے ہی ہنسی نکل آئے تو! مسکراہٹ اور ہنسی پر اختیار بھی ہو۔ بلکہ جہاں یہ احساس ہو جائے کہ ہنسنا تہذیب کے خلاف ہے یا ہنستے ہوئے نظر آنا اچھا نہیں وہاں ہنسی روکنے سے بھی نہیں رکتی۔ کسی بچے کو دیکھئے عام حالات میں کوئی ہنسی کی بات ہوئی تو پیٹ بھر کر ہنس لیا اور پھر چپ ہو گیا

لیکن اگر اس کے والد ماجد پاس بیٹھے ہوں تو بیچارہ لاکھ بار منہ پر ہاتھ رکھتا ہے۔ لیکن ہنسی ہے کہ آئے ہی جاتی ہے رکتی ہی نہیں۔ اسی معاملے میں ہنسی کی حیثیت کھجلی یا کھانسی کے مصداق ہوتی ہے۔ جتنا دباؤ اتنا ہی بڑھتی ہے۔ ہاں تو ایسے چھوٹے موٹے واقعات دن میں سینکڑوں ہوتے رہتے ہیں۔ سینکڑوں بار ہونٹ آپ سے آپ مسکراہٹ میں کھل جاتے ہیں۔ اور ہمیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ابھی پچھلے لمحے میں ہمیں مسرت کا لطف حاصل ہوا تھا۔ یا خوشی کی لہر ہمارے جسم میں دوڑی تھی۔ چونکہ خوشی کے لمحات اتنے عام ہیں اس لئے ہم انہیں اہمیت نہیں دیتے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دن ختم ہوا اور تھکاوٹ کی وجہ سے یا کسی گزشتہ پریشانی کو یاد کر کے ہم دھم سے چارپائی پر لیٹ گئے اور بےساختہ بول اٹھے۔ کیا مصیبت ہے یہ۔ آہ ــــ

یہ ایک آہ دن بھر کی بےتعلق مگر لطیف مسرتوں پر حاوی ہو جاتی ہے اور ایک بےنام غم دل پر چھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ کئی گزرے ہوئے مصائب یاد آجاتے ہیں اور آپ سمجھنے لگتے ہیں کہ آپ بیحد دکھی ہیں۔ دکھ کا رنگ تو ہم سبھی کو لگا ہے۔ شاید آپ کو بھی کوئی نا کوئی دکھ لگا ہو۔ لیکن میں تو بےحد دکھی واقع ہوا ہوں۔ میرا دعویٰ ہے کہ مجھ سے زیادہ دکھی نہ کوئی ہوا ہے نہ ہوگا۔ سب سے بڑا دکھ تو یہ ہے کہ میرا کام سرانجام نہیں پاتا جب تک کہ اسے آپ سرانجام نہ دیا جائے۔ دوسری دقت یہ ہے کہ مجھے لکھنے کا کام پڑتا ہے اور لکھنے سے مجھے نفرت ہے اس کے علاوہ پنسل سے لکھوں تو انگلیاں تھک جاتی ہیں۔ دوات سے لکھوں تو ہاتھ منہ کالے ہو جاتے ہیں عجب مصیبت ہے۔ تیسری قیامت یہ ہے کہ جب تک بتی جلتی رہے کام کرنے کو قطعاً جی نہیں چاہتا۔ اور جونہی بتی بجھے جی چاہتا ہے کہ اٹھ کر کچھ کروں۔ کھانا نہ کھایا ہو تو کام پر جی نہیں لگتا کھاؤں تو پیٹ اس قدر بوجھل ہو جاتا ہے کہ کام کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ پھر یہ مصیبت ہے۔ کہ دیا سلائی جلانے کی کوفت کے بغیر سگرٹ پینا ممکن نہیں۔ چائے جب تک بنائی نہ جائے پی نہیں جا سکتی۔ چند ایک دکھ ہوں تو آپ کو تفصیلاً سناؤں لیکن میرے دکھوں کی کوئی انتہا بھی ہو۔ اکثر اپنے دکھوں کے متعلق سوچتے سوچتے مجھے نفسیات کا وہ سب سے بڑا اصول یاد آجاتا ہے کہ انسان اپنے دل میں وہ اعتبار اکٹھے نہیں کرتا جو تکلیف دہ یا ناخوشگوار بلکہ خوش کن اعتبار جمع کرتا رہتا ہے معاً مجھے شبہ پڑنے لگتا ہے کہ میں بھی خوشگوار اعتبار اکٹھے کر رہا ہوں اور اپنے آپ کو دکھی سمجھ کر امتیاز پیدا کرنے کی یا غم خوری کی لذت حاصل کر رہا ہوں۔ بیساختہ میری ہنسی نکل جاتی ہے اور میں وفور مسرت سے گانے لگتا ہوں "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا"

پھر مجھے اپنے آپ کو دھوکا دینے کی قبیح عادت پر غصہ آنا شروع ہو جاتا ہے۔ یقین کیجئے اپنے آپ پر غصہ آنا بڑی ٹیڑھی بات ہے۔ اس معاملے میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ اپنے آپ کو تھپڑ مارنا بھی ممکن نہیں۔ عبث ہونے کی وجہ سے یہ غصہ جلد ہی دکھ میں تبدیل ہو جاتا ہے اور یہ تازہ دم ہو کر از سر نو اپنے آپ کو دکھی سمجھنے لگتا ہوں اور یہ چکر یونہی چلتا رہتا ہے۔

اہل مغرب کہتے ہیں۔ خوشی حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنی زندگی سے غم کو خارج کر دو۔ اس نظریہ کی خوبی سے مجھے انکار نہیں۔ لیکن اس طریقہ پر کچھ دیر عمل کرنے کے بعد آپ سمجھنے لگیں گے کہ صرف غم کو خارج کر دینا خوشی پیدا کرنا ہے یا ہر وہ چیز جو دافع غم ہے خوش کن ہے اس طرح آپکے خوشی کی حیثیت مثبت نہیں بلکہ منفی ہو کر رہ جائے گی۔

اس کے علاوہ ہر وقت آپ پر یہ احساس حاوی رہیگا۔ کہ آپ کو اپنی زندگی سے غم خارج کرنا ہے مثال کے طور پر اگر آپ ہر سمے یہ محسوس کریں کہ آپ نے اپنی ذات کو گناہ سے پاک کرنا ہے تو لازمی طور پر ہر وقت آپ کو احساس رہے گا کہ گرد و پیش گناہ سے بھرا پڑا ہے۔ بالکل یہی غم کو خارج کرنے کی دائمی کوشش بذات خود آپ میں یہ لاشعوری احساس پیدا کر دے گی کہ غم زندگی پر حاوی ہے۔ غالباً اسی لاشعوری احساس کی وجہ سے مغربی علما نے کہا ہے کہ خوشی کی نسبت غم زندگی پر حاوی ہے۔ ہماری زندگی پر غم کا پھیلاؤ نیلے آسمان کی طرح ہے جس میں یہاں وہاں مسرت کے لمحات تاروں کی طرح روشن ہیں۔ اس استعارے کے حسن اظہار کو تسلیم کرتا ہوں لیکن کون نہیں جانتا کہ مغربی انداز بیان کی اپیل اس قدر پُرزور ہوتی ہے کہ بڑے سے بڑا کافر بھی مومن ہو جاتا ہے۔ قاری کا دل طرز بیان دیکھ کر پھڑک اٹھتا ہے اور اس پر ایسی وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ حقیقت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے ملاحظہ ہو اس بات کو اچھی طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ ہماری زندگی پر غم کا آسمان اس لئے نیلا ہو گیا ہے کہ تاروں میں مسرت کی چمک پیدا ہو سکے نیلے دوپٹے

پر چمکیلے تارے زیبائش کا کام دیتے ہیں لیکن چمکیلے دوپٹے پر نیلے نشان داغ یا دھبے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر غم کا نیلا آسمان مسرت کا چمکدار پھیلاؤ ہوتا اور اس میں مسرت کے چمکیلے تاروں کی جگہ غم کے نیلے دھبے ہوتے تو مسرت بیشتر ہونے کے باوجود پھیکی پڑ جاتی۔

اہل مشرق کی ہر بات نرالی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ ہر آشکار یا ظاہری بات کو رد کرنے کے عادی ہیں ان کا ایمان ہے کہ انسان کا مشاہدہ قابل یقین نہیں کیونکہ حواس خمسہ پر مبنی ہے۔ اور حواس خمسہ کی مدد سے انسان حقیقت کو پانے کی بجائے اس سے اور بھی دور ہو جاتا ہے انہوں نے خوشی کے مسئلے پر سوچا۔ ظاہر تھا کہ غم کو زندگی سے خارج کر دیا جائے تو انسان کی زندگی خوشی سے بھر جائے۔ چونکہ یہ امر ظاہر تھا کہ اس کے اہل مشرق کیلئے نا قابل قبول تھا۔ مزید سوچ بچار کے بعد انہوں نے اعلان کر دیا۔ کہ خوشی حاصل کرنے کے لئے لازم ہے کہ انسان اپنی زندگی سے خوشی خارج کر دے۔ بظاہر یہ بات اجتماع ضدین دکھائی دیتی ہے لیکن اہل مشرق ظاہرہ کے سراب سے خوب واقف ٹھہرے۔ اس بات سے ان کا مقصد خوشی کو رد کرنے سے نہ تھا بلکہ ذاتی خوشی کو خارج کرنا تھا۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ انسان صرف اسی خوشی کو خوشی سمجھتا ہے جو ان کی ذات سے گہرا تعلق رکھے یا جس میں ان کی ذات کو یا ان کے متعلقہ لوگوں کو فائدہ پہنچے۔ جن سے ان کے جذبات شدت سے وابستہ ہیں۔ انسان بے غرض اور بے لاگ مسرت کو خوشی نہیں سمجھتا۔ اور صرف اس لئے بے غرض لمحات یا...... مسرتوں کی فراوانی کے باوجود محظوظ نہیں ہوتا۔ تو ان کو بے غرض مسرتوں سے آشنا کرنے کے لئے انہوں نے ذاتی خوشی کے خلاف پرچار کیا۔

ہمارا ان ان گنت بے لاگ لمحات مسرت کے باوجود دکھی رہنا صرف اس بات کا شاہد ہے کہ لاشعوری طور پر ہم نے خوشی کی کیفیت کو نفع اور دولت سے وابستہ کر رکھا ہے۔ اگر ہم اپنی ذات اور اپنے متعلقے خول سے نکلکر اپنے اردگرد بے لاگ اور بے لگاؤ نظر دوڑائیں تو کیا دیکھینگے ہم کہ ہمارے اردگرد چاروں طرف مسرت کے دیپک روشن ہیں۔ اور گردوپیش کا ہر واقعہ پیغام انبساط لئے ہوئے ہے۔ ہر منظر مسرت کے نقوش سے بھرا ہے۔ اگرچہ خارجی واقعات مسرت کی کیفیت پیدا کرنے کے متحرک ہوتے ہیں۔ لیکن یہ امر مسلمہ ہے کہ وہ ایک خالص داخلی کیفیت ہے۔ تو یہ لازم نہیں کہ ہر خارجی منظر یا واقعہ ہر کسی کے دل میں خصوصی محسوسات پیدا کرے۔ مثلاً موسم گرما کی ایک خنک اور اندھیری رات کو آپ اداس پڑے پہلو بدل رہے ہیں۔ ہوا سامنے کھڑے دھندلے شیشم کی ٹہنیوں میں سرسرا رہی ہے۔ نیچے گلی میں کتا رو رہا ہے۔ آپ کو کسی کل چین نہیں پڑتا۔ آپ سونے کی کوشش میں آنکھیں بند کر لیتے ہیں — پھر جو آپ آنکھ کھولتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں۔ آپ کے سامنے چاند چڑھ آیا ہے۔ اس کی زرد کرنیں چاروں طرف چھائے جا رہی ہیں شیشم کا درخت چپ چاپ پنجوں کے بل کھڑا اس کی طرف جھانک رہا تھا۔ دور کوئی کنواں گانا شروع کر دیتا ہے۔ ایک اضطراب آپ کو اٹھ بیٹھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ آپ کے ہونٹوں سے ایک ہلکی سی آہ نکل جاتی ہے۔ اور دل میں ایک پر لذت کسمساہٹ رینگنے لگتی ہے۔ اب یہ بات قطعی طور پر آپ کی اپنی مرضی پر موقوف ہے کہ اس حسین خواب کی جسے چاہیں تعبیر کریں۔ چاہے جملا اٹھیں آہا۔ زندگی کس قدر حسین ہے یا آہ بھر کر گنگنانے لگیں۔

"وہ چاندنی راتیں آگئیں" — ہر صورت میں آپ کے احساسات کی نوعیت وہی رہے گی۔ چاہے آپ اس کیفیت کی لذت کو تسلیم کریں یا نہ کریں۔ لیکن اس ذہنی کیفیت میں لذت کا عنصر غالب ہوگا۔ اگرچہ مسرت کا یہ ایک واہ تازہ غم کے نیلے آسمان کے پس منظر پر لگا ہوگا لیکن اسی وجہ سے اس کا اثر اور بھی گہرا اور شدید ہوگا

لمحات مسرت کی مثالیں دینا بے کار ہے کیونکہ مسرت کی کیفیت پیدا کرنا فرد کے انفرادی رجحانات پر موقوف ہے پھر بھی میں چینگ ٹنگ ساں سے معذرت کے ساتھ چند ایک لمحات مسرت کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں

آہا کیا یہ مقام مسرت نہیں۔

(۱) موسم سرما میں رات گئے سینما سے واپسی پر آپ چپکے سے بستر میں پڑے ہیں ساتھ والے کمرے میں بیگم آپ کے لئے انڈے بناتے ہوئے آپکی چھپے اور کڑاہی سے فضول خرچی اور گھر دیر سے آنے کا آپ کی شکایت کر رہی ہے آپ دل ہی دل میں اس کی باتوں کی حقیقت کو محسوس کر رہے ہیں واقعی آپ کو ان دنوں فضول خرچی نہیں کرنی چاہیئے۔ ابھی مکان کا کرایہ ادا کرنا ہے اور وہ درزی اف آپ ایک جھرجھری سی محسوس کرتے ہیں۔ پھر

واپسی پہ راستے میں کس قدر اندھیرا تھا اور گلی کے کتے اف۔ مچھروں کا شور کس قدر واہیات شور تھا۔ واقعی خشک امیری کے سوائے کچھ نہ تھا۔ ناحق خواہ مخواہ وقت ضائع کیا۔ لیکن یہ طبیعت کی انتاد کو کیا کیا جائے اس وقت خرچ کرنے کو جی بھی چاہتا ہے۔ جب خرچ کرنے کی قطعی گنجائش نہ ہو لیکن آخر آپ کمانے والے ہیں۔ آپ کا حق ہے کہ چاہے خرچ کریں چاہے فضول خرچی کریں بیگم کو آپ کی باتوں پر نکتہ چینی کا کیا حق ہے۔ آپ کو غصہ آنا شروع ہو جاتا ہے خواہ مخواہ لکچر دے رہی ہے آئی ہے گھر کی اقتصادیات سمجھنے والی۔ بیوقوف ہے جو خواہ مخواہ بولے جاتی ہے۔ آپ متبخر بھری ہنسی ہنس دیتے ہیں۔ بڑی سر کھائے مجھے کیا۔ اور آپ رضائی کو اچھی طرح لپیٹ کر بیگم کا لکچر کسی اور زاویہ سماعت سے سننا شروع کر دیتے ہیں اوئی۔ معاً بیگم کی چیخ سنائی دیتی ہے۔ اڑتے گھی کا گرم گرم قطرہ اس کے بازو پر پڑ جاتا ہے۔ ہائے اللہ وہ چیختی ہے اور کرد لکچر کبھی ــــــ آپ منہ پر رضائی لے لیتے ہیں کہ وہ سن نہ۔

آہا ــــ کیا یہ مقام مسرت نہیں۔

(۳) شام کے وقت سسرال میں اکیلے بیٹھے ہوئے آپ سوچ رہے ہیں ۵ روپے بچوں کو دینے چاہئیں۔ دو ایک سالے لے جائیں گے۔ پھر واپسی کا کرایہ بھی دینا ہے۔ اف سسرال آنا کس قدر مہنگا پڑتا ہے۔ اور پھر میں اتنے آدمی ہونے کی وجہ سے دلہن کا منہ دیکھنے کا موقع بھی ملتا دکھائی نہیں دیتا۔ آپ پیچ و تاب کھانا شروع کر دیتے ہیں۔ دفعتاً دلہن میز سے گلاس اٹھانے کے لئے ادھر آتی ہے۔ ان جانے میں آپ کا ہاتھ اندھیرے میں دلہن کی طرف لپکتا ہے اور آپ چپ چاپ اس کے جسم پر زور سے چٹکی بھر لیتے ہیں۔

آہا ــــ کیا یہ مقام مسرت نہیں

(۳) اگرچہ بظاہر آپ مہمان سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں لیکن آپ کا دھیان اس بات پر لگا ہے کہ آپ کی جیب میں صرف دو روپے باقی ہیں جو بمشکل شام کے گزارے کیلئے کافی ہوں گے۔ اور قصائی نے اُدھار دینے سے انکار کر دیا۔ گھی بھی ختم ہو چکا ہے۔ اگر رام لال بمبئی نہ گیا ہوتا۔ تو سب ٹھیک ہو جاتا۔ کمبخت کس وقت بمبئی چلا گیا ہے سب سے قرض مانگ دوں لیکن ملنے کی اُمید بھی ہو۔

آپ اسی فکر میں ڈوبے ہوتے ہیں کہ مہمان بول اٹھتا ہے۔ اچھا بھئی کیا وقت ہوگا اب۔ اور پیشتر اس کے کہ آپ جواب دیں وہ کہتا ہے مجھے آج ۲ بجے کی گاڑی سے جانا ہے (آج)۔ بے اختیار آپ کے منہ سے نکل جاتا ہے۔

آہا ــــ کیا یہ مقام مسرت نہیں

(۴) آپ سڑک پر جا رہے ہیں سامنے سے ایک بنٹر بر دعر ہو ــ بڑے انداز سے آ رہی ہے اس کی چال کس قدر نشیلی ہے اور انداز کس قدر حسین۔ آپ جھوم جاتے ہیں۔ اور بڑے شوق سے قریب ہو کر اس کی طرف دیکھتے ہیں کہ اس حسین مرقع کی ایک جھلک دیکھنا نصیب ہو جائے دل اچھل کر منہ میں آ جاتا ہے لیکن منہ بالکل ڈھکا ہوا ہے۔ کوئی درز نہیں اور ہاتھ۔ اف دستانے۔ لباس تک کا کوئی حصہ بھی ظاہر نہیں۔ اف آپ کے دل میں اک تڑپ سی پیدا ہوئی۔ معاً آپ کی نظر اس کے پاؤں کی طرف پڑتی ہے ارے چھوٹے چھوٹے تپلے تپلے سے خمدار سفید پاؤں برف کے گالوں جیسے۔

آہا ــــ کیا یہ مقام مسرت نہیں۔

(۵) اتوار کا دن ہے آپ تن تنہا سامنے دفتر کی فائلوں کا انبار لئے بیٹھے ہیں۔ انگلیاں لکھتے لکھتے تھک گئی ہیں۔ مگر دفتر کا کام ختم ہونے میں نہیں آتا۔ گرمی سے پسینہ بہہ رہا ہے۔ مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں چاروں طرف پرزے یہ کباڑی گی دوکان کی طرح بکھری پڑی ہیں۔ آج صفائی کرنے کی بھی فرصت نہیں ملی۔ دیواری چپکلیاں دام اٹھائے تاک میں بیٹھی ہیں چھت پر جالے تنے ہیں۔ کل کے ڈنر کا بچا کھچا کونے میں پڑا ہے جس پر ایک چوہا بیٹھا ہے۔ یہ چپکلیاں۔ مکھیاں اور چوہا۔ آپ کے احساس تنہائی کو اور بھی شدید کر رہے ہیں۔ ایک آہ بھر کر آپ پھر سے لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ آئی بھی جا آ آن۔ ساتھ والے گھر سے ایک حسین اور شوخ آواز گونجتی ہے۔ آپ کے ہاتھ سے قلم چھوٹ جاتا ہے دوات فائلوں پر گر جاتی ہے۔ منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے۔

آہا ــــ کیا یہ مقام مسرت نہیں

(۶) ایک شام کو آپ گھبرا کر کوٹھے پر چڑھ جاتے ہیں چاروں طرف جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے میٹھائے گھروں کے انبار لگے ہیں۔ اس نظارے

ہیں کوئی ایسا مقام دکھائی نہیں دیتا کہ آپ کی نظر کو تسکین دے آپ پھر سے چاروں طرف دیکھتے ہیں۔ دور تک کوئی رنگدار آنچل تک دکھائی نہیں دیتا۔ آپ اکتا کر واپس آنے لگے ہیں تو آپ کی نظر سامنے کوٹھے پر پڑتی ہے جہاں ایک مونچھوں والا نوجوان پتنگ اڑا رہا ہے۔ بدمعاش۔ آپ کے منہ سے بے ساختہ نکل جاتا ہے۔ یہ پتنگ اڑانا تو محض بہانہ ہے۔ ورنہ پتنگ اڑاتے ہوئے مونچھیں مروڑنا اور آنکھیں چمکانے کا مطلب ضرور کسی تاک میں لگا ہے۔ نفرت سے آپ کے ہونٹ بٹوہ بن جاتے ہیں۔ پھر آپ اس کی نگاہوں سے اندازہ لگا کر اس جانب دیکھتے ہیں جدھر وہ مسکرا رہا ہے ارے ــــ آپکا دل مسوس کے رہ جاتا ہے وہ مکان نیچا ہے اور آپ کو نظر نہیں آ سکتا آپ بھاگ کر اس کونے سے دیکھتے ہیں۔ اس کونے سے دیکھتے ہیں۔ لیکن وہ کوٹھا دکھائی نہیں دیتا جہاں وہ مہ لقا کھڑی ہے جسے وہ تاڑ رہا ہے۔ پھر آپ حقارت سے اس مونچھوں والے پتنگ کی طرف دیکھتے ہیں بدمعاش!! محلے میں گند مچا رکھا ہے!! وہ کاٹا دفعتاً آپ کے کان میں شور سنائی دیتا ہے۔ کیا دیکھتے ہیں آپ کہ مونچھوں والے کا پتنگ کٹا ہوا جا رہا ہے اور اس کی مونچھ گر گئی ہے۔ وہ کاٹا آپ کے دل میں سے آواز آتی ہے

آہا ــــ کیا یہ مقام مسرت نہیں۔

(۷) پردہ سیمیں پر آپ اس شوخ اور الھڑ کو بدمعاش کے نرغے میں پھنسے دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں۔ بدمعاش اس معصوم دوشیزہ کی طرف بڑھا آتا ہے۔ اس کے ناپاک ارادے اس کی آنکھ اور بھوؤں سے ظاہر ہیں۔ دوشیزہ کے چہرے پر گھبراہٹ اور بے بسی دیکھ کر آپ کا دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔ بدمعاش لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ ہائے اب میں کیا کروں۔ آپ سینما کی کرسی میں پہلو بدلتے ہیں۔ بدمعاش کے ہونٹ خون کی پیاسی جونک کی طرح اپنے مقصد کی طرف بڑھتے ہیں۔ آپ کے دل میں اضطراب اور ڈر کا طوفان کھولتا ہے۔ گلا خشک ہو جاتا ہے۔ سانس اکھڑ جاتا ہے۔ حلق میں کانٹا سا کھڑا ہو جاتا ہے معاً کمرے کا چور دروازہ دھم سے ٹوٹ جاتا ہے اور ہیرو اندر آ داخل ہوتا ہے۔ ہا ــــ آپ ایک اطمینان بھرا لمبا سانس لے کر کرسی پر ٹیک لگائے بیٹھ جاتے ہیں۔

آہا ــــ کیا یہ مقام مسرت نہیں۔

میں سب سے زیادہ بدقسمت ہوں اور دکھی ہوں۔ لیکن کبھی کبھار اپنے دکھوں کے متعلق سوچتے سوچتے مجھے نفسیات کا سب سے اہم اصول یاد آ جاتا ہے کہ انسان اپنے دل میں ابھار پیدا کرتا ہے جو اس کے لئے ناخوشگوار ہوں۔ بلکہ وہ ناخوشگوار ابھار اکٹھے کرتا رہتا ہے۔ دفعتاً مجھے شبہ پڑتا ہے کہ میں خوشگوار ابھار اکٹھے کر رہا ہوں۔ اور غم سے لذت اندوز ہو رہا ہوں۔ بے ساختہ میری ہنسی نکل جاتی ہے۔ لیکن جلد ہی مجھے اس بات پر غصہ آنا شروع ہو جاتا ہے کہ میں اپنی مکاری کو ہنس کے ٹال رہا ہوں۔ اپنے آپ پر غصہ آنا بے حد ٹیڑھی بات ہے۔ اس معاملے میں سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ

ضمیر جعفری

مطرب کوئی گیت سنا

آرزؤں کا حسرت خانہ ارمانوں کی بستی ہے
ایک خلش، اِک بیتابی، یہ ہستی بھی کیا ہستی ہے
ہوش و خرد سب اچھے لیکن مستی پھر بھی مستی ہے
ایک مکمل انگڑائی کے ساتھ ذرا بربط کو اٹھا!
مطرب کوئی گیت سنا!

دنیا کے غم یونہی رہیں گے، دنیا کا غم کرنا کیا؟
رات کو اشک بہانا کیسا، دن کو آہیں بھرنا کیا؟
آخر جب مرنا ہی ٹھہرا، نت نت کا پھر مرنا کیا؟
گیت پہ گیت سناتا چل، میں سنتا ہوں، تو گاتا جا!
مطرب کوئی گیت سنا!

گیت، کہ جن سے نیند کی مستی بھر جائے ارمانوں میں
گیت، کہ جن کی لَے سے دھارے جم جائیں طوفانوں میں
غم بہہ جائیں، میں بہہ جاؤں، جیسی سُندر تانوں میں
دیکھ! یہ وقت غنیمت ہے، لے ساز پکڑ، مضراب اٹھا!
مطرب کوئی گیت سنا!

مانتا ہوں کہ میرے وطن میں عبرت کی تصویریں ہیں
جسم کی زنجیروں سے بھاری، روحوں پر زنجیریں ہیں
ہم تم سو تدبیر کریں، تقدیریں پھر تقدیریں ہیں
ان پر رونا دھونا کیسا، تیرا میرا زور ہی کیا!
مطرب کوئی گیت سنا!

دیکھ گلی میں امنڈا ہے سیلاب حزیں مزدوروں کا
لاچاروں، معذوروں، سوختہ جانوں اور مجبوروں کا
دھوپ سے تونسے جسموں پر رِستا ہوا خون ناسوروں کا
تو بھی ایک سسک رو میٹھی دھن میں کوئی تان سنا!
مطرب کوئی گیت سنا!

گیت، جو کھویا رہتا ہے ساون کے سنہرے جھالوں میں
گیت، جو سویا رہتا ہے کلیوں کے بند پیالوں میں
گیت، کہ جھلمل کرتا ہے میرے تاریک خیالوں میں
ساز کی لے میں ڈوب کے کوئی مدھ متوالا نغمہ گا!
مطرب کوئی گیت سنا!

دو دن کے جینے میں بھی دم گھٹتا ہے ارمانوں سے
تنکا آخر تنکا ہے کیا الجھے گا. طوفانوں سے
موت جب اِک ساعت نہیں دیتی اپنے سرو ایوانوں سے
ہم بھی اِک لمحہ نہیں دینگے موت کو اپنے جینے کا!
مطرب کوئی گیت سنا!

انٹرنیشنل سائن آرٹ پروڈکشن

کی

شاندار پیشکش

گردش

ستارے

آشا پوسلے۔ کرشنا۔ ونود۔ بخشی۔ روفی اور دوسرے

ڈائرکشن
آر۔ ایس۔ بالی

پروڈیوسر
آئی۔ ڈی۔ کھیرا

کہانی
ایس۔ ڈی۔ باتش

صوبجاتی حقوق کیلئے لکھئے

کنور فلمز لمیٹڈ۔ بیڈن روڈ ـــــ لاہور

بلال احمد

نشانیاں

"انجمن عقد بیوگان" کے دفتر سے نکل کر راؤ صاحب کی خوبصورت موٹر نئی دلہن کالندی کو لئے ہوئے فوراً ہی اسٹیشن پر جا پہنچی۔ راؤ صاحب دوسرے روز "گیان پرکاش" میں چھپنے والی "دوسری شادی پر مبارکباد" کو پڑھنے کی خاطر بھی پونا نہ ٹھہر سکے۔ وہ اپنی نئی دلہن کو بہت جلد وطن پہنچنے کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔ چنانچہ وہ دونوں تیز تیز چلتے ہوئے شولاپور جانے والی گاڑی میں سوار ہو گئے۔

وہ جس ڈبے میں بیٹھے تھے اس میں ان دونوں میاں بیوی کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ کالندی کھڑکی کے قریب بیٹھی تھی اس کے خوبصورت رخسار خوشی سے کندن کی طرح دمک رہے تھے اور اس کی پیشانی پر تبدیلیٔ قسمت کی نشانی "سرخ بندی" لئے نہایت دلکش معلوم ہوتی تھی۔

راؤ صاحب جب ریل کی کھڑکی میں کھڑے چرٹ پی رہے تھے تو مارے خوشی کے پھولے نہ سماتے تھے۔ جب گاڑی پلیٹ فارم چھوڑ کر آہستہ آہستہ رینگنے لگی تو انہوں نے کھڑکی بند کر دی اور کالندی کے بالمقابل آ بیٹھے۔

آج پہلی ہی بار راؤ صاحب کو دیکھ کر کالندی شرما گئی۔ راؤ صاحب نے کہا۔ گاڑی خوب تیز چل رہی ہے۔ ساڑھے گیارہ بجے تک ہم شولاپور پہنچ جائیں گے۔

کالندی نے پوچھا "کل چھٹی نہیں ہے؟"

"نہیں تو کچہری تو جانا ہی ہوگا۔ مگر دوپہر کو تین بجے کے قریب واپس آ جاؤں گا"

یہ کہہ کر راؤ صاحب مسکرا دئے۔ کالندی نے ہوا کے جھونکے سے اڑنے والا آنچل سنبھالا۔ اس کی ہرن جیسی آنکھوں میں بھی مسکراہٹیں ناچ رہی تھیں۔ راؤ صاحب بولے "کھڑکی بند کر دوں!"

رات کو بارہ بجے راؤ صاحب اور کالندی شولاپور جا پہنچے۔ سٹیشن پر ان کی نئی کار تیار کھڑی تھی۔ اس میں بیٹھ کر وہ لوگ اپنے شاندار بنگلے پر آ گئے۔

بنگلے کی آرائش و زیبائش کو دیکھ کر کالندی حیران رہ گئی۔ اسے خود ہی اپنی قسمت پر رشک ہونے لگا۔ بیوگی کی بے لطف اور تکلیف دہ زندگی کو تیاگ کر اس نے ایک دفعہ "نئی اور انوکھی" دنیا میں قدم رکھا تھا۔

اس کے برے دن اب گزر چکے تھے۔ شوہر کی موت کے بعد اسے جن مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا ان کی یاد ہی سے کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ اب اس کی زندگی کی مرجھائی ہوئی ہستی پر امید کی نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ آج اپنے ماضی پر غور کرنے سے بھی اس کا جی گھبراتا تھا۔

(۲)

میٹھی نیند سے میٹھی میٹھی انگڑائیاں لیتی وہ صبح سویرے ہی اٹھ بیٹھی۔ کافی پینے کے بعد راؤ صاحب اور کالندی کھڑکی سے جھانک رہے تھے۔ راؤ صاحب کہنے لگے "تمہیں گھر پسند آیا کہ نہیں"۔

"کیوں نہیں۔ یہ بنگلہ کتنا خوبصورت ہے۔ کتنا پرسکون کتنا دلکش"

"لیکن تم نے ابھی پورا بنگلہ دیکھا کہاں ہے؟ آؤ چلو دکھلائیں"

راؤ صاحب اور کالندی بنگلے کا ایک ایک کمرہ گھوم پھر کر دیکھنے لگے۔ دروازے پر آویزاں "خوش آمدید" کا بورڈ دیکھ کر اس نے پوچھا "یہ کہاں کا بنا ہوا ہے؟"

"اسے میری پہلی بیوی نے بنایا تھا۔ وہ جو میرے ادھر لٹکا ہوا ہے وہ بھی اسی نے بنایا تھا"

کالندی کے چہرے کی ساری رونق جاتی رہی۔ ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ اتنے میں دونو دیوان خانے میں جا پہنچے۔ کونے میں رکھے ہوئے گراموفون کو دیکھ کر کالندی بولی "اوہ گراموفون....؟"

"ہاں اسی کے لئے خریدا تھا۔ اسے گانے سے بڑا شوق تھا۔"

کالندی کی خوشی پر پانی پھر گیا۔ اس نے گراموفون کو ہاتھ نہیں لگایا۔ بھنویں تن گئیں۔

راؤ صاحب ایک ایک چیز کی تاریخ بیان کر رہے تھے۔ لیکن کالندی پر گویا غائب دماغی کی سی کیفیت طاری تھی۔ اپنی سوتن کی نشانیوں سے سجے ہوئے بنگلے کو دیکھ کر اس کا سارا حوصلہ کافور ہو گیا تھا۔ سامنے لگے ہوئے راؤ صاحب اور پہلی بیوی کے فوٹو کو دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ بن پڑے تو لات مار کر اسے چور چور کر دے۔

"یہ بیٹھنے کا کمرہ...... یہ گلدان شادی کے وقت تحفے کے طور پر ملا تھا۔ 'اس' کے مرنے کے بعد سے یہ کمرہ بند پڑا تھا۔ دیکھو تو سہی کتنی خاک اور گرد جمع ہو گئی ہے۔"

راؤ صاحب بنگلے کی تعریف کا حال سنا رہے تھے مگر کالندی آپے سے باہر تھی۔ اس کی سمجھ میں ایک لفظ نہ آیا۔ وہ تو دروازے کے پردے پر کڑھی ہوئی تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ پردے کو ہاتھ میں اٹھایا اور چھوڑ دیا۔ ممکن ہے اس کی سوکن ہی نے وہ تصویر بنائی ہو۔

باورچی خانے کی کتنی ہی چیزیں اس کی سوکن کی یاد دلاتی تھیں وہ بڑھ گئیں۔

راؤ صاحب سے کوئی ملاقات کرنے آیا۔ لہذا انہیں باہر جانا پڑا۔

آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے بال کھولے۔ اس کا چہرہ کملا گیا تھا۔ مسرت کی لہریں مٹ چکی تھیں۔ گھر کی سابقہ مالکہ کے خیال نے ایڑی سے چوٹی تک آگ لگا رکھی تھی۔ اس کی ایک ایک نشانی کو برباد کئے بغیر کالندی کو آرام نہیں مل سکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ان چیزوں کا نام و نشان بھی باقی نہیں چھوڑے گی۔ خانگی اشیاء کی پہلی ترتیب کو بگاڑ کر نیا اہتمام کیا جائے گا۔ ورنہ نئی دنیا میں نئے سرے سے بہار نہیں آ سکتی۔

کالندی نے آنکھوں تلے دبا ہوا چوٹی کا ڈورا اور زور سے دبایا۔ اور بالوں کو جھٹک پیچھے پھینک دیا۔

راؤ صاحب کچہری جانے لگے تو اپنے ہاتھوں سے بنا کر انہیں پان دیا۔ اور ہنسی خوشی ان کو رخصت کیا۔ ان کے جانے کے بعد اس کے چہرے پر مضبوط عزم اور متانت کے آثار ہویدا ہوگئے۔ وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں سے دبا کر بار بار اپنے ارادے کی پختگی کا اعلان کر رہی تھی۔

کچہری سے موٹر واپس آنے پر اس نے ڈرائیور کو بلایا۔ "اس کاغذ پر لکھا ہوا سامان ٹھیک سے لا سکو گے؟"

"جی سرکار!"

اتنے میں باورچی اپنے گھر جانے لگا۔ کالندی نے اسے قریب بلا کر کہا "کیا باورچی خانے میں کسی نئے برتن کی ضرورت نہیں؟"

باورچی خاموش کھڑا رہا۔

"جاؤ دیکھو کونسا برتن کم ہے۔ پرانے برتن نکال دو اور ایک نئی فہرست پیش کرو۔"

باقی دو ملازموں کو بلا کر دیواریں صاف کرائی گئیں۔ پھر ڈرائینگ روم کا سامان باہر نکلوا کر دوبارہ اپنے ہاتھوں سے ترتیب دیا۔ ریڈیو خریدنے کی تجویز نے بیچارے گراموفون کو جلاوطن کیا۔ کمروں کی پرانی تصویروں کے بجائے پونا سے لائے ہوئے فوٹو آویزاں کئے گئے۔ غالیچوں کو جھاڑ کر از سر نو بچھایا گیا۔ خواب گاہ کو مہمان خانے میں تبدیل کر دیا۔ اور پلنگ اٹھوا کر دوسرے کمرے میں بچھوا دئے۔ اور اس کو نئے ساز و سامان سے آراستہ کیا گیا۔ غرض اسی طرح دوسرے کمروں کی بھی کایا پلٹ کر رکھ دی گئی۔ اب راؤ صاحب کی پہلی بیوی کی کوئی بھی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔

"خوش آمدید" کے پرانے بورڈ کی بجائے نیا بورڈ سجایا گیا۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے پردے تک تبدیل کر دئے گئے۔ باورچی خانے کو نئے ڈھنگ سے سنوارا۔ غریب باتھ روم کا رنگ بھی بدل گیا۔ لائبریری بھی اس زبردست انقلاب سے محفوظ نہ رہی۔ کئی الماریاں ادھر سے ادھر تبدیل کر دی گئیں۔ پائیں باغ میں بھی مناسب تبدیلیاں شروع

کردی گئیں۔ برسوں کی گھسی ہوئی روشوں پر کٹی ہوئی سُرخی کے انبار لگ گئے۔ مالی کو باغ کی نگہداشت کے سلسلے میں نئے احکام مِل گئے غرض دن بھر پورے کا پورا عملہ کالندی کے حکم سے بنگلے کی ترمیم و تنسیخ میں مصروف رہا۔ اِدھر اُدھر پڑی چند کتابوں پر کالندی کی سوتن کا نام لکھا تھا۔ وہ بھی اس نے بالالتزام مٹا دیا۔

جس طرح بادشاہ اپنے مفتوحہ علاقوں کے حکمرانوں کی چھوٹی سے چھوٹی یادگار بھی فنا کر دینا چاہتا ہے بالکل اسی طرح کالندی اپنے شوہر کی پہلی بیوی کی تمام نشانیوں کو ایک ایک کرکے مٹا رہی ہے۔

گھر کا نیا رُوپ دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے اب اطمینان کی سانس لی۔ اسے کیسی روحانی مسرت کا گہرا احساس ہونے لگا۔ گھڑی میں دو بج چکے تھے۔ تین بجے راؤ صاحب آنے والے تھے۔ کالندی آئینے کے سامنے گئی۔ بال بکھرے ہوئے اور چہرے پر گرد جمی ہوئی تھی۔ وہ بعجلت غسل خانے میں گھسی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

(۳)

پہلے کالندی نے اپنی گلابی ساڑھی درست کی۔ پھر پنڈلیوں تک پاؤں دھو ڈالے۔

لوٹا فرش پر رکھ کر وہ پھر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس نے بالوں کی دراز رنگین لٹیں ایک جھٹکے سے سنواریں۔ گردن کو بائیں طرف جُھکا کر داہنے کان کی لونگ نکالی۔ اس کے بعد گردن داہنی طرف مُڑی بائیں کان کی لونگ نکالتے ہوئے اس کے ہاتھ یکایک رُک گئے۔ اور وہ بجید متین نظر آنے لگی۔ اس کا چہرہ ڈراؤنا معلوم ہو رہا تھا۔

وہ نہ جانے کتنی دیر اسی طرح کھڑی لونگ کو دیکھتی رہی۔ رخساروں کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ ہونٹ سوکھ گئے۔ آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔

یہ لونگیں اس کے پہلے شوہر نے بڑے پیار سے اسے دی تھیں۔

اس نے اپنی سوتن کے لگائے باغ کو روند کر تہس نہس کر ڈالا تھا۔ اور اس طرح ماضی پہ پردہ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن نتیجہ یہ نکلا۔ کہ غیر ارادی طور پر دل میں اس کے اپنے ماضی کی یاد تازہ ہو گئی....

پہلے شوہر کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگی۔ اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔

باہر راؤ صاحب کچہری سے واپس آکر کالندی کی پوچھ گچھ کر رہے تھے۔

گھر کا انقلاب نقشہ دیکھ کر انہیں بڑی خوشی ہوئی۔ یکایک انہوں نے جیب سے گھڑی نکالی۔ اور ہمیشہ کی عادت کے مطابق گھڑی کا پچھلا ڈھکنا کھولا۔ اس میں اپنی پہلی بیوی کی تصویر دیکھ کر وہ چونک پڑے اور ایک قدم پیچھے ہٹ گئے ÷

پھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

(بھرتری ہری)

فکر تونسوی

دو نئی فلمیں

نرگس:- "نرگس" دیکھ کر پھر یقین ہونے لگتا ہے کہ ہمارے اچھے بھلے فلمساز بھی ابھی تک فرسودگی کی دلدل سے نہیں نکل سکے۔

افسانے کی فرسودگی، ہدایت کاری کی فرسودگی، موسیقی کی فرسودگی، مکالموں کی فرسودگی، اور فرسودگی کی ایک کثیف اور اکتا دینے والی مسلسل دھند ہے۔ جو شروع سے آخر تک "نرگس" پر چھائی ہوئی ہے۔ کہانی کا مرکزی خیال اسی پرانے سماجی مسئلہ کے گرد چکر کاٹتا رہا ہے۔ کہ محبت کو ذات پات اور سرمایہ و محنت کی کشمکش سے بلند تر رہنے کی اجازت دے دینی چاہیئے ظاہر ہے کہ اس مسئلہ پر بیسیوں فلم کمپنیوں نے متواتر و مسلسل ایسی فلمیں پیش کی ہیں جن میں سے چند ایک ہی اثر انگیزی کے اعتبار سے کامیاب رہی ہیں۔ اور باقی ناکام رہی ہیں۔ انہیں ناکام فلموں کے زمرے میں "نرگس" کا بھی اضافہ کر لیجئے ——— کسی مستقل سماجی کمزوری کو بار بار عریاں کرنا معیوب اقدام نہیں لیکن جب وہ کمزوری فن کے نقطۂ نگاہ سے دکھائی جاتی ہے۔ تو اگرچہ اس کے بنیادی خیال میں تبدیلی پیدا کرنا ممکن نہیں ہوتا لیکن اس کے پیش کرنے کے انداز میں جب تک اچھوتا پن اور انفرادیت پیدا نہیں کی جائے گی۔ اس وقت تک فنی اعتبار سے وہ ناکام ترین شمار کی جائیگی "نرگس" میں وہ اچھوتا پن اور انفرادیت بالکل دکھائی نہیں دیتی۔ بلکہ تقلید کا آسرا لے کر فلم کا ڈھانچہ کھڑا کیا گیا ہے۔ یہ تقلید فلم ساز کے ذہنی اور تخلیقی افلاس کی چغلی کھاتی ہے۔ اور ستم ظریفی تو یہ ہے کہ نقل کے لئے بھی عقل استعمال نہیں کی گئی۔ بہت سی ایسی سوشل فلموں کے چند علیحدہ علیحدہ ٹکڑوں کے چربے اتار کر کہانی کو گھسیٹ گھسیٹ کر پایۂ تکمیل تک پہنچایا گیا ہے۔ کہ ایک ذہین فلم بین کو اپنی مشینی زندگی کے قیمتی لمحوں کے ضائع چلے جانے کا افسوس ہوتا ہے۔ افسانہ نگار، خیال کی مرکزیت کو اثر انگیز بنانے کی کوشش میں عجیب و غریب اور مضحکہ خیز ٹکڑے جوڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جو کسی اعتبار سے بھی واقعاتی نہیں کہے جا سکتے نہ جانے سرحد کے کونسی قبائلی علاقے میں ایک پہاڑی چشمے کے ارد گرد ایک جج اور ایک سرکاری وکیل اپنے بنگلے نصب کئے بیٹھے ہیں۔ جہاں ان کی نیم بورژوا اولاد رومانس کے کھیل کھیلتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ پشاور یا کوئٹہ۔ یا کہاں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر وہ چرواہی جو کسی تھیٹر کی رقاصہ معلوم ہوتی ہے کسی پہاڑی علاقے میں نہیں پائی جاتی۔ اور آخر میں قبائلی ڈاکوؤں کا پچڑ شاید صرف اسی لئے لگایا گیا ہے تاکہ "نرگس" نام کی وضاحت ہو جائے۔ ورنہ فلم کے ۹۰ حصے تک فلم کی کہانی اور "نرگس" کے نام میں کوئی مناسبت دکھائی نہیں دیتی۔ غرض ایسے کتنے ہی پچڑوں کا بے ڈول اور بے ڈھب مجموعہ ہے جس کا نام ڈی، ڈی کیشپ نے "نرگس" رکھ دیا ہے۔

موسیقی میں چند مختلف فلمی طرزوں کو نہایت بے باکی سے اپنا لیا گیا ہے مکالموں میں شیکسپیر بازی قدم قدم پر پیدا کی گئی ہے۔ جو خالص تھیٹر کل انداز کی ہے۔ تصنع سے بھرپور اور اثر سے خالی البتہ چلتے چلتے چند ایک جاندار فقرے ضرور آگئے ہیں۔ جو سمجھدار ناظر کو ایک لمحے کے لئے چونکا دیتے ہیں۔ بیشتر مکالمے کتابی نوعیت کے ہیں۔ اور ہر کردار جیسے اپنے فقرات اپنے آپ سے کہتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کچھ اس طرح جیسے اُسے فلم میں دوسرے کرداروں کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہے۔

ہدایت کاری میں کوئی مخصوص انفرادیت دکھائی نہیں دیتی۔ کوئی نیا اور تخلیقی نقطہ پیدا نہیں کیا جا سکا۔ ایک عام فلم کی طرح عام سی ہدایت کاری کی گئی ہے۔ اسی طرح منظر نگاری اور تصویر کشی بھی ایک عام فلم کے سے خصائص رکھتی ہے۔

لے دے کر ساری فلم میں دو کردار ہی ایسے ہیں۔ جن پر توجہ مرکوز رہتی ہے۔ ایک ہے شاہنواز، جس نے ساری فلم میں اپنی انفرادیت کی جوت جگائے رکھی ہے۔ اگرچہ ہدایت کار اور افسانہ نگار کے شکنجوں نے اسے کئی مقامات پر ابھرنے سے روکے رکھا ہے۔ پھر بھی وہ ساری فلم پر مسلط رہا ہے۔ دوسری ہے بے بی تبسم۔ اُس کے توتلے الفاظ جن میں ذہانت کی آمیزش کی گئی ہے۔ اگرچہ کئی مقامات پر تصنع دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے وہ اُن الفاظ

کے ادا کرنے پر مجبور کر دی گئی ہو۔ لیکن پھر بھی ایک ننھی سی لڑکی کے منہ سے ایسی ذہانت آمیز گفتگو، ایک عام فلم بین کے لئے تحیر کے ساتھ دلچسپی مسرت اور قہقہوں کے سامان پیدا کر دیتی ہے۔ اور فلم کے تفریحی پہلو کو قابل قبول بنا دیتی ہے۔

مجموعی طور پر ایسی فلموں میں کوئی افادی عنصر دکھائی نہیں دیتا ہماری سماج کے صرف دو طبقے اپنا وقت اور روپیہ "نرگس" کی بھینٹ چڑھا سکتے ہیں۔ ایک سطحی فلم بین، جو اس میں اپنے لئے جنسی تسکین کے پہلو ڈھونڈھ لیتا ہے۔ دوسرا وہ نیم بورژوا طبقہ جو فلم میں اپنی نیم بورژوا جماعت کی رومانی زندگی کے چند نقوش دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان دونوں طبقوں کو فلمی فن کی افادیت سے کوئی سروکار نہیں۔ اگرچہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ ایسی فلمیں آمدنی کے اعتبار سے قابل رشک حیثیت اختیار کر جاتی ہیں۔ لیکن ہمارے ملک کے موجودہ سیاسی اور سماجی حالات کے پیش نظر ہمارے فلمسازوں کو صرف حصول دولت کو ہی اپنا مقصد نہیں بنانا چاہیئے۔ بلکہ کوشش کرنی چاہیئے کہ فلموں کے موضوعات کا انتخاب ہمارے جدید اور سیاسی ماحول کے مطابق ہو۔ اس طرح وہ حصول دولت کے علاوہ افادی نقطۂ نگاہ کو بھی ساتھ ساتھ رکھ سکیں گے ٭

گوکل:- پربھات فلم کمپنی ہمیشہ دیو مالا پر تصویریں پیش کرنے میں اپنا ایک مخصوص مقام پیدا کر چکی ہے۔ "گوکل" اسی دیو مالا سیریز کی ایک کامیاب تصویر کہی جا سکتی ہے۔ اس کی کہانی ہندوستان کے محبوب ترین انسان کرشن بھگوان کی زندگی کے ایک اہم حصے سے تعلق رکھتی ہے۔ کرشن بھگوان پیدائش سے لے کر ظالم شہنشاہ کنس کی موت تک اس فلم میں کارفرما نظر آتا ہے۔ ایک عام اور سطحی فلمساز کے مقابلے پر "پربھات" نے اس فلم میں ایک افادی پیغام پوشیدہ رکھا ہے۔ یعنی اس نے کرشن کو ایک ایسے ہیرو کے طور پر پیش نہیں کیا۔ جو عوام کے لئے صرف عقیدتمندانہ اور جذباتی اپیل رکھتا ہے۔ بلکہ فلم میں شروع سے لے کر آخر تک کرشن ایک انقلاب پسند جوان مرد کی صورت میں نمایاں رہتا ہے۔ ایک ایسا انقلابی جو زندگی کی راہوں پر مجبوری، بے بسی اور غلامانہ احساسات رکھنے والے عوام کو شاہیت پسندانہ قوتوں کے خلاف اُبھارتا ہے۔ اور اجتماعی جذبات کو آزادی اور مساوات کے نقطہ پر مرکوز کر کے شہنشاہیت کی جڑیں کھوکھلی کرتا ہے۔ اس کا سب پہلا احتجاج وہاں سے شروع ہوتا ہے۔ جب گوکل کے گوالوں کی خوبصورت اور صحت مند گائیوں کا شیریں دودھ متھرا لے جایا جاتا ہے۔ جہاں سامراجی راجہ کنس کی رانیاں غسل شیر کی عادی ہوتی ہیں۔ اور جو عوامی لہو کو نچوڑ کر اپنی جابرانہ اور عیش پسندانہ تمناؤں کی تسکین کرتی ہیں۔ وہ عوام جو کرشن کی احتجاج بھری انقلابی صدا اُن سے پہلے سامراج کے اس ظلم کو متواتر برداشت کرتے رہتے ہیں کرشن کو مسرت اور تازگی کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور اس کے آزادی پسندانہ خیالات کا ساتھ دے کر جبر و استبداد کا مقابلہ کرتے ہیں۔

جبر و استبداد سے مقابلہ کرنے کا یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک انقلابی کرشن کو ساتھ لے کر متھرا کے عوام کنس کے محل پر ہلہ نہیں بول دیتے اور کنس اپنی موت آپ نہیں مر جاتا۔ یہ مقام مسرت ہے۔ کہ ڈائرکٹر فتح لال نے ہماری دیو مالا کو جدید ترین زاویۂ نگاہ سے دیکھنا اور پیش کرنا شروع کیا ہے۔ اور اس طرح دوسرے فلمسازوں کے لئے ایک نیا راستہ کھول دیا ہے۔ ایسی فلموں سے ہماری موجودہ سینما، جو سامراجی وحشت کا شکار ہو رہی ہے۔ اپنے اندر بیداری، زندگی، تازگی اور آزادی کی ایک نئی لہر دوڑتی ہوئی محسوس کرے گی۔ ہدایت کار نے فلم کی افادیت کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے کامیاب تفریحی اور جذباتی ٹکڑے بھی شامل کئے ہیں۔ جن سے اثر انگیزی میں کھوکھلے پن کی بجائے معیاری اہمیت پیدا ہو گئی ہے۔ خاص طور پر رادھا کا معروف فلسفہ محبت ایسے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جس میں جنسی جھلکیوں کی بجائے بلند پایہ تصور حسن و عشق پیدا ہو گیا ہے۔ اور پھر اس میں رادھا کو بطور اشارے کے ایک مثالی پیکر کی حیثیت دے گئی ہے۔ یعنی اس طرح کہ رادھا کو کرشن سے جسمانی محبت نہیں ہے۔ بلکہ ایک اٹوٹ عقیدت ہے۔ ایسی عقیدت، جو جنسی محبت میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور اس عقیدت مندانہ الفت میں ایک تاریخی ہمہ گیر اور مستقل پیغام بھی پنہاں ہے۔ کہ انقلابی قوتوں کے حسین تر خیالات اور خوبصورت سلوگنے اور محبوب نظریات سے ہر انسان کو محبت ہونی چاہیئے۔

مکالمے کافی کامیاب ہیں۔ اور ان میں شعریت اور فلسفہ کو ہم آہنگ

جگن ناتھ آزاد

طوفان کے بعد

رات کے پردے میں ہو جاتا ہی سامانِ سحر
ختم گو ہو بھی چکا عالمِ ظلمات کا دور
جا چکی رات اُفقِ مشرق پہ پو پھٹ نہ سکی
ایک افسانہ ہوتا اگرچہ خزاں کا عالم
دیدۂ شوق نے یہ سمجھا کہ طوفان گئے
لیکن اے دیدۂ مشتاق ذرا غور سے دیکھ
اس ماحول سے بیگانہ رہا جوشِ جنون
سانس آزاد فضاؤں میں کبھی لے نہ سکی
حیف صد حیف کہ انسان کا یہ فکرِ منیر
جس نے سورج کی شعاؤں کو گرفتار کیا
ہم نے مانا کہ ہے طوفان کا مفہوم یہی
اپنی منزل تو نظر آئے فرد کو لیکن
باوجود اس کے نگاہوں کا تقاضا ہے یہی
تیز طوفان فضاؤں میں مچلتے ہی رہیں

رات کے پردے میں سامانِ سحر ہو نہ سکا
صبح کا تارا نمودار مگر ہو نہ سکا
تیرہ و تار فضاؤں کی سیاہی نہ گئی
صحنِ گلشن سے بگولوں کی تباہی نہ گئی
زندگی ایک سکون پائے گی ہیجان کے بعد
کتنے طوفان نمودار ہیں طوفان کے بعد
عقلِ منزل کی طرف جا کے پلٹتی ہی رہی
زندگی موت کے دامن میں سمٹتی ہی رہی
تندِ طوفان پہ ذرا سا بھی اثر کر نہ سکا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا
زندگی کی شبِ تاریک سحر ہو نہ سکے
اپنی منزل کی طرف اس کا گزر ہو نہ سکے
لڑکھڑاتی ہوئی دنیا کو سنبھلنا ہے ضرور
میری بجھتی ہوئی قندیل کو جلنا ہے ضرور

باقی صدیقی

کون

الم دم بخود ہے، خوشی گا رہی ہے
نظر ہنستا ہے، لرزح لہرا رہی ہے
تمنا تمنا سے ٹکرا رہی ہے
یہ کون آ رہی ہے یہ کون آ رہی ہے

ادا بھولی بھالی، نظر لاابالی
لچکتی ہوئی جیسے پھولوں کی ڈالی
نہ یہ وار خالی، نہ وہ وار خالی
یہ کون آ رہی ہے یہ کون آ رہی ہے

یہ کالے دوپٹے پہ چاندی کی تاریں
اندھیرے میں کچھ نور کی آبشاریں
شب تار میں جگنوؤں کی قطاریں
یہ کون آ رہی ہے یہ کون آ رہی ہے

جوانی کے احساس میں پیچ کھاتی
گھٹا کی طرح جھومتی، لہلہاتی
نگاہوں میں ہنستی، خیالوں پہ چھاتی
یہ کون آ رہی ہے، یہ کون آ رہی ہے

میں کیسے محبت کی آفت کو ٹالوں
میں کس طرح ہستی کو ہستی بنا لوں
نظر کو سنبھالوں کہ دل کو سنبھالوں

یہ کون آ رہی ہے یہ کون آ رہی ہے

کرنے کی بہترین کوشش کی گئی ہے۔ اگر روایتی اسلوب کے برخلاف اس کی زبان کو سنسکرت آمیز بنانے کی بجائے عام فہم ہندوستانی کی شکل دی جاتی تو زیادہ بہتر تھا۔ گانے پربھات کی روایات کو نہ صرف قائم رکھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ بلکہ ان میں ترقی کے جراثیم بھی پائے جاتے ہیں۔

اداکاروں میں اننت مراٹھے نے کرشن کے کیریکٹر کو بڑی حسن کاری کے ساتھ نبھایا ہے۔ سپیرو والطبو دکنس اور کملا کوٹنس بطور رادھا کے بھی کافی کامیاب رہے ہیں رقاصی اور صدا بندی معیاری ہے۔ ہم پربھات اور اُس کے کارکنوں کو "گوکل" کے پیش کرنے پر مبارکباد پیش کرتے ہیں علی الخصوص قمر جلال آبادی کی انفرادیت کو واضح ہوتا اور نکھرتا ہوا دیکھ کر تو پنجابی ادیبوں کی ذہانت کا پھر معترف ہونا پڑتا ہے۔

نقد و تبصرہ

دوماہی "سویرا" لاہور

لاہور سے مشہور ترقی پسند رفیقوں احمد ندیم قاسمی، نذیر چودھری اور فکر تونسوی نے ایک نئے دوماہی ادبی سلسلے کا آغاز کیا ہے۔ اس کا پہلا نمبر ہمارے پیش نظر ہے۔ اور ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں۔ کہ اردو ادب کے صحافتی دور میں اس قسم کا اجتہادی قدم آج تک نہیں اٹھایا گیا۔ امریکہ اور یورپ کے رسائل میں، البتہ اس قسم کی بلند پایہ اور ممتاز انفرادیت دکھائی دے جاتی ہے۔ ایسی انفرادیت جو "سویرا" کے ترتیب دینے والوں نے پہلے ہی نمبر میں پیدا کر دی ہے۔

اس اڑھائی صد صفحات کے ضخیم نمبر میں جو کسی معیاری ادبی پرچے کا سالنامہ دکھائی دیتا ہے۔ ہندوستان بھر کے چوٹی کے ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور سیاست دانوں کی تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ سارے پرچے میں ادب کے متعلق ایک مخصوص ترقی پسندانہ نقطۂ نگاہ کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ اتنے اہم مضامین کا بیک وقت ایک کتابی مجموعے کی شکل میں جمع ہونا اس امر کا ثبوت ہے کہ "سویرا" ہمارے اردو ادب میں ایک انقلاب انگیز پروگرام کے ذریعے اپنا سکہ بٹھا جائے گا۔

داخلی محاسن کے علاوہ ہمیں "سویرا" کے حسن طباعت کی بالخصوص داد دینی پڑتی ہے۔ ٹائیٹل پیج کی گیٹ اپ اور مضامین کی ترتیب کا منفرد سلیقہ اور طباعت و کتابت کی حسن آرائی سبھوں نے مل جل کر "سویرا" کو امٹ اور اثر انگیز کتاب کی حیثیت عطا کر دی ہے۔

ہم کارکنانِ "سویرا" کو اس نئے سلسلے کے اجرا پر ہدیۂ تحسین پیش کرتے ہیں۔ اور اہل ذوق حضرات کو اس کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں۔ دفتر "سویرا" ۱۶۔ سرکلر روڈ لاہور سے مبلغ دو روپے میں مل سکتا ہے۔ سالانہ نمبر کے لئے دس روپے تجویز کئے گئے ہیں۔

ایڈیٹر

فلمی اطلاعات

لاہور میں "نرگس" کی کامیابی: جس میں کپچرز بمبئی کی پہلی فلم مقامی کیپٹل سینما میں ریلیز ہوگئی ہے۔ لاہور کی پبلک نے مجموعی طور پر اس تصویر کو بہت سراہا ہے۔ ہر شو پر تماشائیوں کا ایک بڑا بھاری ہجوم دکھائی دیتا ہے۔ یہ فلم پربھات کے شہرت یافتہ ڈائرکٹر ڈی۔ ڈی کیشپ کی ہدایت کاری کا کامیاب نتیجہ ہے۔ مکالمے اور گانے مشہور ادیب اور شاعر قمر جلال آبادی نے لکھے ہیں۔ فن کاروں میں نمایاں کام نرگس، شاہنواز، ڈیوڈ اور بے بی تبسم کا ہے۔ امید کی جارہی ہے کہ یہ فلم لاہور میں ابھی کئی ماہ تک اسی رفتار سے شائقین کی توجہ کا مرکز بنا رہے گی۔

گوکل اور بھگت پرہلاد ایک ہی وقت میں: ۲۷ر دسمبر سے لاہور کے دو بہترین سینماؤں پیلس اور ریجنٹ میں علی الترتیب پربھات فلم کمپنی کی "گوکل" اور وشنو سینےٹون کی "بھگت پرہلاد" ریلیز ہوگئی ہیں۔ یہ دونوں تصویریں بھگتی کے ایک مشترکہ موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ گوکل میں اننت مراٹھے، کملا کوٹنس، سپرو، اور اندومتی نمایاں کردار ہیں۔ اور بھگت پرہلاد میں لیلا چٹنس، الہاس، اننت مراٹھے، ڈکشت اور راجکماری شکلا کام کرتے ہیں۔ چونکہ یہ فلمیں ہندو دیومالا کے متعلق ہیں۔ اس لئے ہندوؤں میں خاص مقبولیت حاصل کریں گی۔

"پرائے بس میں" کراؤن ٹاکیز میں: انڈیا یونائیٹڈ پکچرز لمیٹڈ کا رقص اور موسیقی سے بھرپور تحفہ "پرائے بس میں" ۲۰ر دسمبر سے کراؤن ٹاکیز لاہور میں دکھایا جارہا ہے۔ یہ فلم جہاندیدہ اور تجربہ کار فلمساز سیٹھ کرتا کی خاص نگرانی میں نامور ہدایت کار داؤد چاند نے لاہور میں تیار کی ہے۔ پران، آشا پوسلے، زبیدہ، ظہور شاہ، نذر، دیپک، غلام قادر اور سلیم رضا نے کمال فن میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ موسیقی آل انڈیا ریڈیو کے مشہور موسیقار نیاز شامی اور مونو کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ عوامی مذاق کو صحیح طریقہ پر سمجھ کر یہ فلم تیار کی گئی ہے۔ نتیجہ کے طور پر اس کی کامیابی میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

"زمین آسمان" رٹز میں اکٹھے ہوگئے: کامیاب ترین دھارمک اور سوشل شاہکار پیش کرنے والی ملک کی مشہور فلم کمپنی پرکاش پکچرز کی نئی فلم "زمین آسمان" رٹز لاہور اور چترا امرت سر میں بیس دسمبر کو ریلیز ہوگئی ہے۔ اس میں جیون، انجنا اور ریدیش سہنا خاص اداکار ہیں۔

منشی پریم چند کا "چوگان ہستی": ہندوستان کے مایۂ ناز افسانہ نگار منشی پریم چند کے مشہور ناول "چوگان ہستی" کو ڈائرکٹر ایم بھوانی نے فلما کر پیش کیا ہے۔ یہ فلم پربھات ٹاکیز لاہور میں بیس دسمبر سے دکھائی جارہی ہے۔

"فرض" کے لئے گراں قدر پیشکش: اہرا انڈیا سٹوڈیو میں نیو ہندوستان پکچرز لمیٹڈ کی اولین فلم "فرض" کی شوٹنگ تکمیل کے آخری مراحل پر ہے۔ گذشتہ دنوں رونی کا ایک شاندار ناچ فلمایا گیا ہے جس کے متعلق کامیاب راؤں کا اظہار کیا جارہا ہے۔ ڈسٹری بیوٹرز نے اس کے حقوق کے حصول کے لئے زبردست جدوجہد شروع کردی ہے۔ سی پی اور سی آئی کے لئے ایک گراں قدر رقم پر میسرز راجپوتانہ جودھپور نے اس فلم کے حقوق حاصل کرلئے ہیں۔ دوسرے علاقوں کے لئے سرکردہ ڈسٹری بیوٹرز ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

بتکدہ کی "حیا":- "بت کدہ" اپنی اولیں پیش کش "بت تراش" کی تکمیل کے بعد خاموش نہیں بیٹھ رہے۔ بلکہ اُس کے کارکناں نے اپنی نئی فلم "حیا" کا اعلان کر دیا ہے مشہور ڈائرکٹر فضلی۔ اس کا افسانہ، سٹڈیو اور ہدایت کاری کے فرائض سرانجام دیں گے پروڈیوسر کے ایچ خاں نے نامور ادیب اور شاعر ساغر نظامی کی خدمات بھی حاصل کر لی ہیں۔ وہ اس فلم کے مکالمے، گانے لکھیں گے۔

انقلاب پکچرز انقلاب کی راہوں پر:- ڈائرکٹر صادق کے ہونہار اسسٹنٹ مسٹر ارشد گجراتی بطور ہدایت کار انقلاب پکچرز لمیٹڈ رائل پارک لاہور کی نئی فلموں کے لئے منتخب کر لئے گئے ہیں۔ کمپنی مذکور کے اولیں معیاری اور اصلاحی شہ پارے کے نام کا جلد اعلان ہونے والا ہے۔ نئے نئے تابناک چہرے ایک خالص معیار کے مطابق منتخب کئے جا رہے ہیں۔

"دکھو جی"۔ ایک جھلک میں:- پنجاب فلم کارپوریشن کی اولیں فلم "دکھو جی" میں ممتاز شانتی ایک پہاڑن تلی کا کام کرتی ہے اس کی کہانی، گانے، اور مکالمے ولی صاحب نے لکھے ہیں۔ خاتون، اٹھ دن، منٹو بائی اور اے شاہ شکارپوری وغیرہ اداکار کام کرتے ہیں۔ اس کے حقوق تقسیم برائے پنجاب و سرحد دی پنجاب پکچرز لمیٹڈ رائل پارک لاہور کے پاس ہیں۔

"برہن" مکمل ہونے لگی:- پروڈیو ایم۔ ایل گپتا کی اولیں پیش کش "برہن" تقریباً مکمل ہو چکی ہے اور جلد تر سنسر کے روبرو پیش کر دی جائے گی۔ اس میں اہم اداکار روپا، پران، بیگم پروین، رام لال، البشاہ اور مشہور رقاصہ گلو شامل ہیں۔

ایشیاٹک آرٹ پروڈکشن لمیٹڈ کا قیام:- پنچولی آرٹ پروڈکشن سے علیحدہ ہونے کے بعد مشہور فلمی ماہرین احسان گھوش اور ہر چرن سنگھ کداترہ نے اپنی ایک نئی فلم کمپنی "ایشیاٹک آرٹ پروڈکشن" کا اعلان کیا ہے۔ "اک نیری نشانی" ان کی پہلی فلم ہو گی۔ اس کے مکالمے مشہور ترقی پسند افسانہ نگار "رامانند ساگر" کے زور قلم کا نتیجہ ہوں گے۔

آج اور کل کی تیاریاں:- بین الاقوامی شہرت کے مصنف خواجہ احمد عباس آج کل لاہور کی چترا پروڈکشن لمیٹڈ کی پہلی فلم "آج کل" کو ڈائرکٹ کر رہے ہیں۔ راج کمل کلا مندر کی مشہور اداکار "نیناتارا" کی خدمات بطور ہیروئن حاصل کر لی گئی ہیں۔ یہ فلم ایک اہم سیاسی موضوع کے تحت تیار کی جا رہی ہے۔

فلمستان لمیٹڈ کی شاندار سرگرمیاں:- فلمستان لمیٹڈ بمبئی نے صنعت فلمسازی میں نئی نئی راہیں، نئی نئی فلمیں اور نئے نئے چہرے پیش کرنے کے سلسلہ میں اپنی سرگرمیاں جاری کر رکھی ہیں۔ ہر نئی فلم میں دو تین نئے چہرے پیش کئے جا رہے ہیں۔ مشہور و معروف پروڈیوسر ایس مکرجی نے کئی فلموں کی ترتیب و تکمیل کے بعد محب وطن لوکمانیہ تلک مرحوم کی داستانِ زندگی کو فلمانے کا اعلان کیا ہے۔ تلک مرحوم کے مصنف ساتھی این سی کیلکر کی زیر نگرانی لوکمانیہ کی داستانِ زندگی کی ریسرچ مکمل ہو چکی ہے۔ اُمید ہے فلمستان کی یہ پیش کش فلمی صنعت میں ایک نئے باب کا اضافہ کرے گی۔

جاگیردار کی "جیل یاترا":- جاگیردار نے اپنی کمپنی کی پہلی فلم جیل یاترا کے اداکاروں کا اعلان کر دیا ہے۔ اس میں گجانن جاگیردار کامنی کوشل، ہیمونتی، راج کپور، بکرم کپور، ہریش، بدری پرشاد، شانتی دیوی، اور نند کشور کے نام قابل ذکر ہیں۔

کاہن آرٹ پروڈکشن کی "تامیا":- پروڈیوسر کے ایل۔ کاہن کی پہلی فلم "تامیا" کا فلمی حلقوں میں بڑی بے چینی سے انتظار کیا جا رہا ہے۔ اس میں راج رانی، کندن لال، اکلدار اور ہری موہن اہم اداکار ہیں۔

چندر کانتا کی شوٹنگ ہو رہی ہے:- پرائڈ آن انڈیا پکچرز کی پہلی فلم "چندر کانتا" شوٹنگ کے مراحل طے کر رہی ہے۔

خان شاطر غزنوی اُس پر اپنی پوری قوت صرف کر رہے ہیں۔

"موہنی" تکمیل مراحل میں:- جواں بخت، جواں سال اور بلند پایہ پروڈیوسر مہندر اگل اپنی پہلی فلم "موہنی" کو ایک لافانی تحفہ بننے کے لئے دن رات ایک کر رہے ہیں۔ اس کی ہدایت کاری مشہور ڈائرکٹر ڈی۔ این۔ سرانجام دے رہے ہیں۔ اداکاروں میں چاند برق، روپی، وینا، بے بی شمشاد اور نرنجن قابل ستائش ہیں۔ موسیقی میں مشہور موسیقار ٹھیمی رام اور بھائی لال اپنی روح شامل کر رہے ہیں۔ بڑی تیزی کے ساتھ تکمیل کے مراحل طے کر رہے ہیں۔

لکھنؤ کی ایک نئی فلم کمپنی:- ادبی خطے لکھنؤ سے ایک نئی فلم کمپنی سائن ٹون لمیٹڈ کا اعلان ہوا ہے۔ اس کے پروڈیوسر مسٹر خلیل ہیں۔ "رشید دلہن" ان کی پہلی فلم ہو گی۔

"بروا" لوٹ آئے:- نیو تھیٹرز سے جدا ہو جانے کے بعد پھر ایک بار مشہور فلسفی ڈائرکٹر "بروا" نیو تھیٹرز میں شامل ہو گئے ہیں۔ یہ شاعر ٹیگور کی کہانی "گورا" فلمائیں گے۔ اہم کام پہاڑی سانیال اور کانن بالا کا ہو گا۔

"ادھورے خواب" فلمائی جائے گی:- مسٹر محبوب اختر نے جو اس سے پہلے بمبئی کی مشہور فلم کمپنیوں کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر رہ چکے ہیں۔ اپنے چند نوجوان اور ترقی پسند دوستوں کے ہمراہ "خیالستان پروڈکشن" لاہور کا اجرا کیا ہے۔ ان کی پہلی فلم "ادھورے خواب" اپنی کاغذی کارروائیوں سے گزر کر شوٹنگ کی منزل تک پہنچ چکی ہے۔ اس کا افسانہ ڈائرکٹر محبوب اختر نے خود لکھا ہے۔ اور موسیقی، نوجوان صاحب طرز شعرا حضرت احمد ندیم قاسمی اور قتیل شفائی کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔

میں کوئی حکیم یا ڈاکٹر نہیں بلکہ سابق مجسٹریٹ درجہ اوّل ہوں۔ زیادہ بیٹھنے کے باعث عرصہ پندرہ سال سے مجھے بواسیر تھی۔ کئی قسم کی دیسی، ولایتی، جرمن، امریکن دوائیں استعمال کیں۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آخر ایک سنیاسی نسخہ لگانے کا ہاتھ لگا جسے اگرچہ بڑی محنت سے تیار کرنا پڑا۔ مگر اس نے واقعی جادو کا کام کیا۔ لگاتے ہی سوزش اور جلن کم ہونی شروع ہوگئی۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں مجھے مکمل آرام ہو گیا۔ اور آرام بھی ایسا کہ کسی مسے کا نام و نشان تک نہ رہا۔

اس اکسیر بواسیر یعنی **کیسکم** کو دونوں قسم کی بواسیر خونی اور بادی کے لئے استعمال کیا گیا۔ اور دونو ہی صورتوں میں اس کو بہت مفید پایا۔ کیسکم آسانی سے پھولے ہوئے مسوں میں پہلے ہی دن سے جذب ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ جلن اور درد کو بند کرتی ہے۔ اور بواسیر کو ہمیشہ کے لئے جڑ سے نکال دیتی ہے۔ دوائی بذاتِ خود بتیر رہے۔

چند رائیں

۱۔ ڈاکٹر میجر ہرکشن سنگھ آئی۔ ایم۔ ایس راولپنڈی:۔ مجھے یہ تصدیق کرنے میں خوشی ہے کہ چوہدری لچھمن سنگھ کی اکسیر بواسیر (کیسکم) کو میں نے بہت مفید پایا۔ بواسیر کا اپریشن کرانے کے بعد بھی مجھے بار بار خونی بواسیر رہتی تھی۔ مگر (کیسکم) چند ہفتہ لگانے سے مجھے جادو کی طرح آرام آیا۔

۲۔ سردار چوہدری عبدالرشید خاں بی۔ اے ڈسٹرکٹ و سیشن جج کپورتھلہ:۔ میرے والد صاحب کو پچاس سال سے بواسیر کی تکلیف تھی۔ چوہدری لچھمن سنگھ کی دوائی نے حیرت انگیز کام کیا۔ بواسیر کے مسے بغیر تکلیف کافور ہو گئے۔ اب انہیں پورے طور پر آرام ہے۔

۳۔ میجر سردار فضل کریم خاں سرہندی دروازہ پٹیالہ:۔ براہِ کرم اپنی دوا بواسیر کی بڑی شیشی (مکمل کورس) بذریعہ ویلیو پے ایبل پارسل ارسال فرما کر مشکور فرمائیے۔ اس سے پہلے چھوٹی شیشی منگائی گئی، وہ مفید ثابت ہوئی۔ شکریہ!

۴۔ سردار لشن سنگھ بی۔ اے تحصیلدار:۔ کیسکم کے استعمال سے مجھے بواسیر سے مکمل آرام ہو گیا۔

قیمت { بڑی شیشی (مکمل کورس) دس روپیہ
چھوٹی شیشی چھ روپے بارہ آنہ } معہ محصولڈاک وغیرہ

آرڈر دیتے وقت اخبار کا حوالہ دیجئے۔

چوہدری لچھمن سنگھ بی۔ اے سابق مجسٹریٹ درجہ اوّل۔ کپورتھلہ (پنجاب)

میں کوئی حکیم یا ڈاکٹر نہیں بلکہ سابق مجسٹریٹ درجہ اوّل ہوں۔ زیادہ بیٹھنے کے باعث عرصہ پندرہ سال سے مجھے بواسیر تھی۔ کئی قسم کی دیسی، ولایتی، جرمن، امریکن دوائیں استعمال کیں۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آخر ایک بیش بہا نسخہ لگانے کا ہاتھ لگا جسے اگرچہ بڑی محنت سے تیار کرنا پڑا۔ مگر اس نے واقعی جادو کا کام کیا۔ لگاتے ہی سوزش اور جلن کم ہونی شروع ہو گئی۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں مجھے مکمل آرام ہو گیا۔ اور آرام بھی ایسا کہ کسی مسّے کا نام و نشان تک نہ رہا۔

اس اکسیر بواسیر یعنی **کیسکم** کو دونوں قسم کی بواسیر خونی اور بادی کے لئے استعمال کیا گیا۔ اور دونوں صورتوں میں اس کو بہت مفید پایا۔ کیسکم آسانی سے پھولے ہوئے مسّوں میں پہلے ہی دن سے جذب ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ جلن اور درد کو بند کرتی ہے۔ اور بواسیر کو ہمیشہ کے لئے جڑ سے نکال دیتی ہے۔ دوائی بذات خود بہتر رہے۔

چند رائیں

۱۔ ڈاکٹر میجر ہرکشن سنگھ آئی۔ ایم۔ ایس راولپنڈی:۔ مجھے یہ تصدیق کرنے میں خوشی ہے کہ چوہدری لچھمن سنگھ کی اکسیر بواسیر (کیسکم) کو میں نے بہت مفید پایا۔ بواسیر کا اپریشن کرانے کے بعد بھی مجھے بار بار خونی بواسیر رہتی تھی۔ مگر (کیسکم) چند ہفتہ لگانے سے مجھے جادو کی طرح آرام آیا۔

۲۔ سردار چوہدری عبدالرشید خان بی۔ اے ڈسٹرکٹ و سیشن جج کپور تھلہ۔ میرے والد صاحب کو پچاس سال سے بواسیر کی تکلیف تھی۔ چوہدری لچھمن سنگھ کی دوائی نے حیرت انگیز کام کیا۔ بواسیر کے مسّے بغیر تکلیف کافور ہو گئے۔ اب انہیں پورے طور پر آرام ہے۔

۳۔ میجر سردار فضل کریم خاں سرہندی دروازہ پٹیالہ:۔ براہِ کرم اپنی دوا بواسیر کی بڑی شیشی (مکمل کورس) بذریعہ ویلیو پے ایبل پارسل ارسال فرما کر مشکور فرمایئے۔ اس سے پہلے چھوٹی شیشی منگائی گئی، وہ مفید ثابت ہوئی۔ شکریہ!

۴۔ سردار لبھ سنگھ بی۔ اے تحصیلدار۔ کیسکم کے استعمال سے مجھے بواسیر سے مکمل آرام ہو گیا۔

قیمت { بڑی شیشی (مکمل کورس) دس روپیہ ۱۰؎
چھوٹی شیشی چھ روپے بارہ آنہ } معہ محصول ڈاک وغیرہ

آرڈر دیتے وقت اخبار کا حوالہ دیجئے۔

چوہدری لچھمن سنگھ بی۔ اے سابق مجسٹریٹ درجہ اوّل، کپورتھلہ (پنجاب)

اعلان عظیم
ہم نہایت مسرت سے اعلان کرتے ہیں۔ کہ جس طرح
ہم نے مظہر آرٹ پروڈکشنز کا شاہکار عظیم پہلی نظر حاصل کر کے فلمی
نمائش کنندگان کو ایک نفع بخش تفریحی تحفہ پیش کیا تھا۔
اب ہماری دوسری ریلیز ہوگی
دکھی
جسے
پنجاب کے مایہ ناز ڈرامانسٹ و شاعر ولی
نے ڈائرکٹ کیا ہے
اور جس میں
ممتاز شانتی ۔ انجم ۔ شہزادی اور اے شاہ
نے لاجواب کام کیا
ہے
جاری کردہ
پنجاب پکچرز لمیٹڈ لاہور
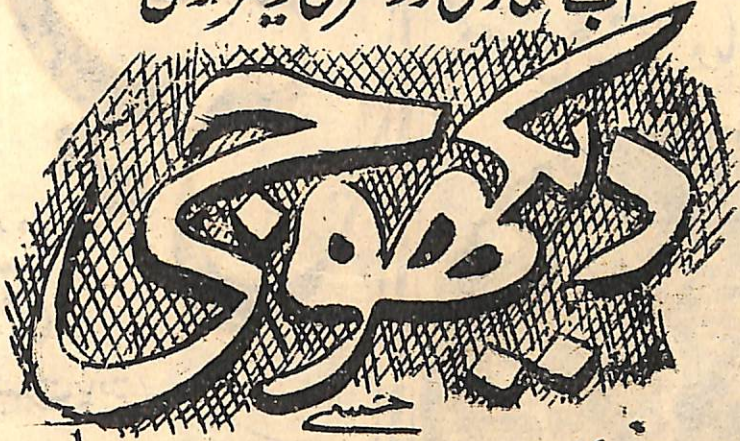
ASHA POSLEY
in
" ARSI "

A seane from " ARSI "
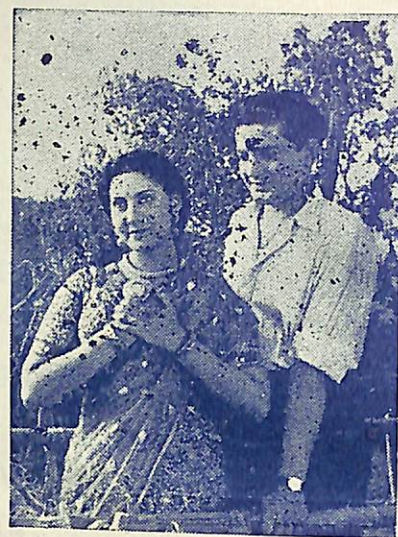
" CHAND BURQE " in " FARAZ "

SURRIYA
in
" DO DIL "

Direction: MADAN MOHAN Supervision: K. D MEHRA
Music: CHANNI & PARKASH Supervision: GHULAM HAIDAR

MOVIE MAKERS LTD., MCLEOD ROAD, LAHORE

عصمت چغتائی

احمد ندیم قاسمی

ممتاز مُفتی

شاد عارفی

فکر تونسوی

بلال احمد

جگن ناتھ آزاد

چندر کانتا

اور دوسرے

The dream girl of Picture-goer
SHIRIN in
BUTKADA'S BUT TRASH

JANUARY,
1947
-/4/-